

اُنڈلس میں اجنبی

مستنصر حسین تارڑ

دارالافتاء دارالعلوم



iqbalkalmati.blogspot.com

کیپٹن پائلٹ

ساجد نذیر شہید کے نام

کیا ایسا ممکن ہے کہ میرے سامنے اب ہمیشہ کے لیے ایک خلا ہوگا،
حرف ہوا ہوگی، ساجی کا جسم نہ ہوگا جس پر میں ہاتھ رکھ سکوں،
جسے جوہم سکوں جسے گلے لگاؤں؟ کیا ایسا ممکن ہے؟

فہرست

۱۔ محبتوں اذیتوں کی جانب، ۱۳۱

۲۔ بچے قور، ۳۷

۳۔ تپتی دوپہری موت، ۲۸۱

۴۔ گرم خوشبو کی شام، ۶۴

۵۔ بد بخت قشتالیہ، ۷۵

۶۔ ثوریا! ثوریا! ثوریا، ۹۷

۷۔ مدینہ سالم، ۱۲۴

۸۔ گویا کہ..... میڈرڈ، ۱۲۹

○

مرہم لطف و وفا تجھ کو کہاں لے کر جنم

ہم سحر تجھ کو کہاں لے گئی تیری پرواز

آگ کس طرح تیرے جسم کے نزدیک آئی

کیسے پڑول کے شعلوں سے دہا شعلہ سنا

(مصطفیٰ زبیدی)

✽ میرا خالہ زاد بھائی، والدین کی اکلوتی اولاد، جو ۵ جولائی ۵، عر کی صبح کو ٹرک میں کسی فنی خرابی
کی بنا پر اپنے ہی ہوائی جہاز کے شعلوں کی لپیٹ میں آئے اور اس کا سنگٹا ہوا ۲۴ سالہ بدن
۶ جولائی ایک سیکے دوپہر میں ٹرک کے لیے مرد ہو گیا۔

کرنل محمد خان

مصنف عموماً اپنی پہلی کتاب پر دوسروں سے دیباچہ لکھواتے ہیں کہ تمہیں سے تعارف بھی ہو جائے اور زبان غیر سے اپنے مخفی محاسن بھی آشکار ہو جائیں۔ بعد کی کتابوں پر دوسرے لوگوں کے دیباچوں اور مقدموں کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ یہی فاروق علامہ اقبال نے بننا اور بے شمار بادشاہانِ عالم کے مصنفین نے بھی ایک مستنصر حسین خاں اس قاعدے کے اُلٹ چلے ہیں۔ انہوں نے اپنے پیسے سفرنامے کا دیباچہ خود لکھا اور کسی بزدلی منارش یا دباؤ کے بغیر اپنے گئی گوائے اور گوائے۔ اب ان کے دوسرے سفرنامے پر ایک غیر کے لیے کچھ متدبر نہ لکھنا کیسے تے تابدار کو اور تابدار کرنے کی کوشش ہے جو ایک لاعلم کوشش ہے کہ مستنصر کی رمی ہوئی تاب میں کسی مزید تاب کی گنجائش نہیں اور ادھر میری شلگی بالکل محدود بلکہ مفقود ہے۔

چند سال ہوئے میں نے پہلے مستنصر کا سفرنامہ ”نیکے تری تلاش میں“ پڑھا اور پھر مستنصر سے ملاقات ہوئی۔ دونوں کو ایک دوسرے سے بڑھ کر خوبصورت پایا اور یہ اسی دور ہرے شمس کا رعب ہے کہ جب مجھ سے موجودہ سفرنامے کا دیباچہ لکھنے کو کہا گیا تو میں نے چار و ناچار فی الفور ایک کہا حالانکہ دیباچہ لکھنا تو درکنار مجھ سے کوئی گرد پوش کے لیے چند سطور بھی لکھنے کو کہے تو میں نے روپوش رہتا ہوں کہ سچ بچ لکھنی ہی نہ پڑ جائیں۔ میرا دیباچہ فوری کا خانہ یکسر خالی ہے۔

مستنصر کا نیا سفرنامہ ”نیکے تری تلاش میں“ میں نہیں، اجرا کی صورت میں پہنچا۔ کچھ یہاں سے کچھ وہاں سے۔ گویا اسے صحیح معنوں میں پڑھا نہیں، صرف پکھا ہے اور

- ۹ - قرطبہ - دور افتادہ ، ۱۴۶
- ۱۰ - قرطبہ - دور افتادہ اور تنہا ، ۱۶۷
- ۱۱ - ہجومِ نخیل ، ۱۷۸
- ۱۲ - واللہ! مستنصر باللہ ، ۲۱۰
- ۱۳ - اور اشیلیہ ، ۲۴۵
- ۱۴ - بادشاہ ، یگیم اور غلام ، ۲۶۴
- ۱۵ - قدیم قزمونہ ، ۳۷۳
- ۱۶ - فلیمنگو ، ۲۸۵
- ۱۷ - جہاں حسن رچ گیا ہے ، ۳۰۳
- ۱۸ - وہ کونسا فوس ہے ، ۳۰۹
- ۱۹ - مریدس ، ۳۳۲
- ۲۰ - غرناطہ تو نہیں چھین گیا ، ۳۴۳
- ۲۱ - کوئے یار کا مسافر ، ۳۵۸
- ۲۲ - اور مار یا زامیر ناچ رہی تھی ، ۳۶۳
- ۲۳ - الحرام میں ایک رات ، ۳۸۴
- ۲۴ - اندلس میں اجنبی ، ۴۰۲

پچھنے پر یہ معلوم ہوا کہ اس کی لذت پہلے سفر نامے سے کسی طور کم نہیں۔ میں ممکن ہے کہ اُنڈس کے تمام سفر میں ان کے ساتھ گھومتا تو اس کتاب مستطاب کی کئی خصوصی لذتوں سے آشنا ہوتا۔ بہر حال اُنڈس میں اپنی پڑھنے کے بعد ایک بات طے ہے کہ جوں جوں مستطاب کا قدم جوانی سے کمالت کی طرف بڑھتا ہے اس کی تحریر جوان تر ہوتی جا رہی ہے اور ایک مصنف کی آبرویا عظمت اس کی تحریر کی جوانی ہے جو لہ زوال ہے نہ کہ اس کا اپنا شباب جو بہر حال ناپائیدار ہے (مذا مستطاب کا شباب تا دیر قائم رکھے)۔

ادب میں آج کل سفر ناموں کا فیشن بہت چل نکلا ہے۔ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ اس کے لیے تخلیقی کرب میں ڈوبنا پڑتا ہے نہ بحر علم میں شناساوری کی ضرورت ہوتی ہے۔ بس سوئی کے جس نامکے سے مسافر گزارا، اسی سے تادی کو بھی گزار دیا اور مسافر نامہ بن گیا۔ بعض چلتے پھرتے لوگ تو اس لیے بھی مونسوع سنی بناتے ہیں کہ اس میں اہل وطن کی نفروں سے دور، اپنی دیار میں مونسوع کے ساتھ اٹھکھیدیاں کرنے کی خاصی گنجائش ہوتی ہے۔ نتیجتاً مسافر نامہ کم اور مزاج بارہ زیادہ بن جائے تو اسے گھٹے کا سودا نہیں کھجاتا۔ بحیثیت مزاج نگار میرا اپنا طریقہ واردات بھی کچھ ایسا ہی ہے۔

اس کے برعکس زمانہ قدیم کے سفر نامے پڑھیں تو یوں محسوس ہوتا ہے جیسے انسان تاریخی اور جغرافیائی کھنڈروں سے گزر رہا ہو اور مسافر نامے کی ہر سرائے اور کنوئیں پر علم کے انبار لگا کر اعلان کر رہا ہو کہ ”لو بیٹا، جتنا ہضم کر سکتے ہو، کر لو اور باقی آئندہ نسلوں کے لیے چھوڑ دو۔“

مستطاب حسین تار کے سفر نامے قدیم اور جدید سفر ناموں کا سنگم ہیں۔ ان میں پرانے سفر ناموں والی معلومات بھی ہیں اور ماڈرن سیاح کا چمکتا ہوا مشاہدہ بھی۔ اس کا قاری بیک وقت ماضی اور حال میں سفر کرتا ہے۔ ماضی کا نقشہ جمانے کے لیے مستطاب تاریخ کا سہارا لیتا ہے اور حال کو بیان کرنے کے لیے وہ اپنے مشاہدے پر اکتفا کرتا ہے۔ پہلی صورت میں اختلاف رائے ممکن ہے کہ خود مؤرخین میں اختلاف ہے لیکن دوسری صورت میں نہیں کہ مستطاب کا مشاہدہ کھرا، خالص اور نا قابل تردید ہے۔

مستطاب سیاحوں میں سے نہیں جو عجیب و غریب میں بیٹھ کر مبینوں کی مسافت گھنٹوں میں طے کرتے ہیں یا ایک ’اے کلاس‘ ہوٹل سے دوسرے ’اے کلاس‘ ہوٹل میں شب بپری کو سیاست کا نام دیتے ہیں۔ مستطاب دھرتی کے ساتھ چلتا ہے۔ لغوی معنوں میں بھی اور استعارۂ بھی۔ وہ آپ کو قریہ قریہ، گمری گمری، کوپہ کوپہ پیدل چلتا یا متناہی بس یا ریل میں سفر کرتا دکھائی دیتا ہے۔ اس کے مشاہدے میں آنے والے انسان ہیں۔ دھرتی پر چلتے پھرنے والے عام انسان! ان میں بوڑھے بھی ہیں اور جوان بھی، حسین بھی اور کریہ بھی، عظیم بھی اور حقیر بھی۔ وہ ان میں سے کسی سے نفرت نہیں کرتا۔ کسی کو اپنے طنز یا تشکیک کا نشانہ نہیں بناتا۔ اس کا نفرت اتنا وسیع ہے کہ اسے دھرتی کے تمام باشندے ایک ہی برادری کے گھرے ہوئے فرد گئے ہیں۔

عجیب بات ہے کہ اپنے وطن میں رہتے ہوئے یوں لگتا ہے کہ وہ کوہلو کا بیل ہے جس کے کندھے پر پٹنالی اور آنکھوں پر کھوپڑی ہیں اور وہ زندگی کے شب و روز ایک جاناگاہ دیگر پر گزار رہا ہے۔ پٹنالی وہ بقول غوثی ”رستے توڑا کر“ ملک سے باہر بھاگ نکلتا ہے لیکن دیار غیر میں پہنچ کر، خواہ وہ کتنے ہی گھنٹے ”اڑا رہا ہو“ اسے ہر وقت محسوس ہوتا ہے کہ اس کے دل کے تار ارضی وطن سے جڑے ہوئے ہیں۔ اس کی خاطر ہی نگاہ مرقاطہ پر ہوتی ہے لیکن باطن کی آنکھ لاہور پر۔

مجھے مستطاب کے سفر ناموں میں جس چیز سے جادو ہو جاتا ہے وہ ان کی فضا ہے: وہ دلربا سیم ایم اُداس فضا۔ نیم اُداسی جو مستطاب کی فضا میں ہے، اُس کی تحریر میں بھی محسوس ہوتی ہے۔ ایک ایسی نیم اُداس فضا جس میں فم کے گھرے بادل ہیں نہ خوشی کی چمکدار دھوپ۔ بس دونوں کے مین مین رو مانیت کی جھین جھین خوشبو سے موطر۔ دیشمی سی اُداسی میں لپٹا ہوا سفر جو محض سفر برائے سفر ہے۔ اس میں دُنیا کو فتح کرنے، علم حاصل کرنے یا معاشرے کو سنوارنے کی کوئی آلائش نہیں۔ مسافر کو صرف دُنیا دیکھنے اور اہل دُنیا کا تماشا کرنے کی آرزو ہے۔

اس آواز و گردی میں جو مقامات اور شخصیات مستطاب کے مشاہدے میں آتی ہیں وہ

محبتوں، اذیتوں کی جانب

ہسپانوی ادیب میگئیل سروانتس اپنے شہرہ آفاق ناول ”ڈان کے خوتے“ کے مرکزی کردار کا تعارف کراتے ہوئے لکھتا ہے۔

”اُس کے ذہنی غفلتار نے اتنی شدت اختیار کر لی کہ وہ سوچنے سمجھنے کی قوتوں سے عاری ہو گیا۔ لاقعد اد کتابوں کے مطالعے سے جنم لینے والے منتشر خیالات اور تصورات اس کے دل و دماغ پر بڑی طرح حاوی ہو گئے۔ اُس کا ذہن رعنائیوں، ضادوں، جنگوں، مقابلوں، زخموں، شکایتوں، محبتوں، اذیتوں اور انہی قسم کے دیگر ممکنات کی پینتات کی آماجگاہ بن گیا۔ نوبت یہاں تک پہنچی کہ کتابوں میں پڑھی ہوئی تمام تخیلاتی داستانیں اُسے مستند تاریخ کی مانند حقائق پر مبنی نظر آنے لگیں۔“

ادریوں ڈان کے خوتے نے مہم جوئی کی تلاش کی غرض سے سفر پر مکرر ہندھی۔ اس کا مطلع نظر شجاعت کے کارنامے دکھا کر دنیا سے بُرائی کی قوتوں کا قلع قمع کرنا اور دھکی انسانیت کے غموں پر مرہم رکھنا تھا۔

میں بھی ایک ایسے ہی سفر پر مکرر ہوتا تھا مگر شاید میرا ذہنی غفلتار ڈان کے خوتے کی مانند شدید نہ تھا۔ میں نے ہسپانیہ کے بارے میں جو داستانیں پڑھ رکھی تھیں وہ تصوراتی تھیں بلکہ تاریخی حقائق پر مبنی تھیں۔ کے خوتے نے اس مہم جریاء سفر کے آغاز سے قبل اپنے باپ دادا کی قدیم اور بوسیدہ زرہ بجز نکال کر ہسپانی اور میں نے سامان

اتنی غیر معمولی نہیں تھیں کہ اس کی دوداد کو امتیاز بخشیں۔ جو چیز اس کی تحریر کو پرکشش اور لازوال بناتی ہے وہ اس کا خوبصورت انداز بیان ہے۔ بعض حصے تو اس قدر چمکے اور شگفتہ ہیں کہ یہ شخص مگر سا سفر نامہ اسی انداز میں لکھتا تو ہمارا مزاج کا کاروبار ٹھپ ہو جاتا۔

دعا ہے کہ مستنصر بکثرت ”شالادریسی تھیوے“ تاکہ اردو ادب میں حسین و جمیل سفر ناموں کا اضافہ ہوتا رہے۔ یہ دنیا مستنصر جیسے لوگوں ہی کے دم سے حسین ہے۔ وہ ملک و شہر کس کام کا جہاں کم از کم ایک مستنصر حسین تارڑ نہ ہو۔

ع۔ ویراں شود آں شہر کہ سے خانہ بدلو

کا خیلا چند کتابوں، ایک پُرانی پرستین اور دو کیمروں سے پُر کیا اور کاندھے پر ڈال لیا۔ اس نے اپنے لاسرگھوڑے "روزی" نامتے "کو ذریعہ سفر بنایا اور میں بھاپ کے دیو پر سواری کر رہا تھا۔ اُسے شجاعت کے کارنامے دکھانے کے لیے کسی ناقابلِ تسخیر قلعے کی تلاش تھی اور میں..... تسخیر ہو جانا چاہتا تھا۔ وہ شبِ ب سری کے لیے کسی چرواہے کی جھونپڑی کا متلاشی تھا اور میں..... اپنی جھونپڑی ایک نیچے کی صورت میں کندھوں پر اٹھائے پھرتا تھا۔

سفر کی مکمل تیاری کے بعد ڈان کے خوتے کو ایک ایسی خاتون کی تلاش ہوئی جس پر وہ اپنا دل نثار کر سکے اور ببادری کے کارنامے سرانجام دینے سے قبل اس کا نام لے کر اپنا نیزہ چوم کے بقول سرداقتس ایک مہم جو شخص مجبورہ کے بغیر ایسے ہی ہے جیسے ایک درخت پھل اور پتوں کے بغیر۔ چنانچہ ڈان کے خوتے نے ایک دیہاتی دوشیزہ کو اپنی مجبورہ قرار دے کر سفر کا آغاز کر دیا..... میں اس معاملے میں ڈان کے خوتے سے پیچھے رہ گیا تھا کیونکہ لاہور شہر کی تنگ گلیوں میں اگر مجبورہ کی تلاش کی جائے تو سفر مہم جوئی کی بجائے سفر آخرت کا آغاز ہو جاتا ہے۔ ڈان کے خوتے کیل کانٹے سے لیس ہو کر اپنے مریل گھوڑے روزی نامتے "پر سوار ہوا اور اُس کی باگیں کھلی چھوڑ دیں کہ بدھسری چاہے چل دے کیونکہ مہم جوئی کا یہی خاصہ ہوتا ہے۔ بھاپ سے پلنے والے جس آہنی دیو پر میں سوار تھا وہ میرے بس میں نہ تھا۔ وہ مجھے پیرس سے سیدھا سانباستیان لیے جا رہا تھا۔ رشتائیوں کی جانب۔ اذیتوں کی طرف۔ محبتوں کی سمت..... جن کے بارے میں میں اب تک صرف کتابوں میں پڑھتا آیا تھا۔

ساری رات ہماری گاڑی فرانس کے وسیع میدانوں اور جنگلوں میں دوڑتی رہی۔ میں نے ڈبے میں سوار مسافروں کا جائزہ لیا۔ ایک غلیظ ہسپانوی مزدور دروہا میں

ایک فرانسیسی جوڑا اور گھٹے ہوئے جسم کی ایک نوجوان عورت جس کا سرخیند کی مدہوشی میں میرے شانے کے ساتھ آگیا تھا۔

ڈبے میں بے پناہ گھٹن تھی۔ تمام مسافر سو رہے تھے مگر خیند مجھ سے کوسوں دُور تھی..... مور کی واپسی۔ رومیوں نے مغربی افریقہ کو ماریلیٹا نہ کہا اور وہاں کے باشندوں کو موری کا نام دیا۔ یہی لفظ ہسپانوی میں مورد کھلایا اور انگریزی میں مور۔ اور پھر تمام مسلمانوں کو بلا تفریق مور کہا جانے لگا یہاں تک کہ غلیظ کے مسلمان اب بھی مور کہلاتے ہیں کیونکہ یہ جزائر ایک ہسپانوی میگالن نے دریافت کیے تھے۔ ہسپانوی جو ہر مسلمان کو مور کہتے ہیں..... مغرناط سے جلا وطن ہونے کے ۷۷۴ برس بعد..... ایک پاکستانی مور کی واپسی..... اپنے وطن اندلس کی جانب۔

ڈبے میں گھٹن ناقابلِ برداشت حد تک بڑھ گئی تھی۔ فرانسیسی تازہ ہوا کو سہم تاقی سمجھتے ہیں اور ہمیشہ اپنے گھر کی اور دورانِ سفر ٹرین کے ڈبے کی کھڑکیاں مصنوعی سے بند کر کے سوتے ہیں..... ہسپانوی مزدور منہ کھولے غرائے لے رہا تھا۔ دونوں راہبائیں بالکل اکڑوں بیٹھی سو رہی تھیں۔ جب کبھی پٹری بدلنے سے ٹرین جھلوتی تو ان کے سر آپس میں ٹکرا جاتے مگر وہ فوراً سنبھل جاتیں اور پھر اکڑ کر بیٹھ جاتیں۔

فرانسیسی جوڑا آپس میں گڈ گڈ ہو کر سو رہا تھا۔ نوجوان عورت کا سر بدستور میرے شانے پر آرام کر رہا تھا۔ اس کا سانس بے حد گرم تھا۔ "معاف کیجئے گا" میں نے آہستہ سے اپنا شاہ ہلایا۔

"اُول" عورت نے نیند میں ڈوبی ہوئی دائیں آنکھ کھول کر کہا اور پھر مسکرا کر میرے اور قریب ہو گئی۔

"معاف کیجئے گا میں ڈبے سے باہر جانا چاہتا ہوں" میں نے شاہ جھٹک کر کہا۔

اُندلس کے جانے پر میں نے اپنی کنہیاں کھڑکی کی چوکھٹ پر لٹکادیں اور باہر دیکھنے لگا۔ ہر شے تاریکی میں ڈوبی ہوئی تھی..... تنگ ہوا میں خوشبو تھی۔ خوشبو اپنے وطن کی..... تو رز قریب آ رہا تھا۔ تو رز۔ جہاں جبل الطارق سے پھرنے کے بعد مسلمانوں کی فتوحات کی طوفانی لہر مدھم ہوئی اور پھر توراہر جو کر زمین پر بچھ گئی۔ سہماں ہسپانیہ اور پرتگال فتح کرنے کے بعد قرطاج کے ایک بڑے حصے پر بھی قابض ہو گئے۔ لیکن مکتا ہے۔ دمشق اور سمرقند کے سلطان کی افواج لگاسکنی کے انھوروں کے باغات اور بوردے کے شہر سے بھی آگے نکل گئیں۔ یہاں تک کہ قرطاج کے جزئی حصے نے دریائے جیرون سے دریائے رہون تک مسلمانوں کے عادات و اطوار اپنا لیے ؟

اُندلس کے اموی گورنر عبدالرحمان الغافقی نے ۳۲۰ھ کے موسم بہار میں بلند کوہ پیرائیز عبور کئے اور دریائے جیرون کے کنارے ڈویک آت یوٹس کو شکست دینے کے بعد بوردے پر حملہ آور ہوا۔ بوردے کے بعد پامناز سرنگوں ہوا اور مسلمان افواج تو رز کی جانب بڑھیں جہاں یورپ کی نیم وحشی افواج چارلز مارٹل کی زیر قیادت صحت آراء تھیں۔ مارٹل کے سپاہیوں نے اپنے بدن بھیڑیوں کی کھالوں سے ڈھانپ رکھے تھے اور ان کے بے ستارہ بڑھے ہوتے بال کندھوں سے نیچے تک آئے ہوئے تھے۔ لڑائی شروع ہونے کے ساتویں روز الغافقی میدان جنگ میں کام آیا۔ عرب بقول انتھونی زینگ ایک زیرک راہنما کی سرکردگی میں آسمان کی بندیاں چھو لیتے ہیں جہاں اس کی غیر موجودگی انھیں ذلت کی گہرائیوں میں دھکیل دیتی ہے۔ الغافقی کے مارے جانے پر عرب بدول ہو گئے۔ اس شب ان کے خیموں میں زمانہ جاہلیت کے قبائلی جھگڑوں نے پھر سر اٹھالیا۔ یعنی ہندی، حجازی اور شامی متفقہ طور پر کسی ایک شخص کو قائد تسلیم کرنے میں ناکام ہو گئے۔ انھوں نے اپنے نیچے سمیٹے اور رات کی تاریکی میں روپوش ہو گئے۔ لیکن مکتا ہے۔ اگر مسلمانوں کی

”اؤں۔ ہوں“ عورت نے سر اٹھایا۔ وہ میری جانب دیکھ کر مسکرائی اور پھر کندھے سے سیکٹر کو بڑے مزے سے دوسری طرف بیٹھے ہوئے ہسپانوی مزدور کے شانے پر سر رکھ کر سو گئی۔ مزدور کے خزانے بند ہو گئے۔

میں ڈبے سے نکلا اور ٹرین کی لمبی راہداری میں اکٹرا ہوا۔ یہاں پستیوں کی گڑگڑاہٹ اور ڈبوں کے آپس میں بھڑکنے کا شور تو تھا مگر تمام کھڑکیاں کھلی ہونے کی وجہ سے ہوا میں تازگی تھی۔ میں نے اپنی سفید برساتی کاکارلگھے کے گرد اچھی طرح پیٹ لیا اور کھڑکی سے سر باہر نکال کر ایک لمبا سانس لیا۔ ہوا میں گھنے جنگلوں اور سرسبز کھیتوں کی ہلک تھی..... میں لمحہ بہ لمحہ اُندلس کے قریب ہوتا جا رہا تھا۔ اُندلس جو میرے طویل سفر کی معراج تھا۔ تھران میں کھدیپ پاتنا تھا کہ میں چند روز اور بٹھرجاؤں۔ میں نے کہا تھا۔ قرطبہ کی محرابوں اور سزناط کے ایوانوں نے مجھے ایک ٹور میں باندھ رکھا ہے۔ میں اس کے آخر میں جا کر دیکھنا چاہتا ہوں کہ یہ ٹور کون ہلا رہا ہے ؟ استنبول کی نیلی مسجد میں مجھے مسجد قرطبہ کے ستون یاد آئے۔ شک ہوم میں مارگیتا نے کہا تھا۔ وہ کونسا ایسا فنر ہے جو تمہیں سب کچھ چھوڑ کر اُندلس جانے پر مجبور کر رہا ہے ؟ ”لندن میں میری نظریں جنوب کی سمت ہی لگی رہیں۔ پیرس کی پاسکل کے اپاہج بندھن بھی میرا راستہ نہ روک سکے۔

”ہیلٹ مریڈا“

میں نے مڑ کر دیکھا تو فرانسسیسی محٹ چیکر منہ بنائے کھڑا تھا۔ اس کی آنکھیں نیند سے بند ہو رہی تھیں۔ میں نے جیب سے محٹ نکال کر اس کے انگوٹھے اور انگلی کے درمیان اٹکا دیا۔

”اگلا شاپ کونسا ہے ؟“ میں نے یونہی پوچھ لیا۔

”تورز“ اس نے جانی لیتے ہوئے کہا اور محٹ چھید کر مجھے واپس کر دیا۔

کھلتا تھا جو بعد میں مجھ کو اندلس لیا ہوا اور پھر اندلس میں بدل گیا۔ عرب ان تمام علاقوں کو اندلس کہتے تھے جو آج کل ہسپانیہ، پرتگال اور جنوبی فرانس کے اس حصے میں جہاں میری گاڑی جارہی تھی شامل ہیں۔

زرد و دریاہاؤں کی انگلیوں میں تیسج کے واسطے پھسل رہے تھے فرنیسی جڑا اپنے شکن آلود لباس درست کر رہا تھا اور ہسپانوی مزدور اپنی بڑھی ہوئی داڑھی کھجلائے کے ساتھ ساتھ ایک پایا کھانے میں مصروف تھا۔ صبح ہو چکی تھی اور ہم ہسپانیہ کے سرحدی قصبے ایردن میں داخل ہو رہے تھے۔ کسٹم کی سینگ خاصا صبر آزما مرحلہ تھا۔ میں فرانس سے ہسپانیہ میں داخل ہونے والے مسافروں کی ایک طویل قطار میں اپنے سامان کا تھیلہ کندھے پر ڈالے پیٹ نام پر کھڑا جمایا لے رہا تھا۔ میری باری آئی تو کسٹم آفیسر نے سامان کھولنے کو کہا۔ میں نے اپنے قبیلے کی گرہ کھول کر اسے کاؤنٹر پر رکھ دیا۔ کسٹم آفیسر نے قبیلے میں رکھی کتابوں پر ایک نظر ڈالی۔ "مورزان سپین" "مورسش سپین" "فوالہجر کی کہانیاں"۔ اس نے باقاعدہ منہ بنالیا اور میرے پاسپورٹ پر مہر لگا کر مجھے فائبر کو دیا۔ میرے پیچھے دو امریکی لڑکیاں کھڑی تھیں جنہیں کسٹم آفیسر نے ہاتھوں ہاتھ لیا۔ سامان کی تلاشی تو درگزر اس نے اس کے پاسپورٹوں پر مہر لگانے کے بعد ان کو سیلوٹ بھی کیا۔ لڑکیاں خوش شکل تھیں اور ہسپانوی چاہے زندگی کے کسی شعبے سے متعلق ہو قدرتی طور پر حسن پرست ہوتا ہے۔ کسٹم سے فارغ ہو کر میں دوسرے مسافروں کے ساتھ ایک ہسپانوی گاڑی میں سوار ہو گیا جو سان باسٹیان تک جارہی تھی۔ ڈبلے میں ایردن کے گرد و نواح میں رہنے والے مزدوروں کا بے پناہ ہجوم تھا جو صبح سویرے سان باسٹیان کے کارخانوں میں کام کرنے جا رہے تھے۔ ان کا لباس اور جسمانی صحت کا معیار اس بات کا پتہ دے رہے تھے کہ ہسپانیہ یورپ کا غریب ترین ملک ہے۔ گاڑی کی رفتار بے حد آہستہ تھی۔ دیوے لائن کے پہلو میں واقع عمارتوں کی سفیدی اتری ہوئی تھی اور جا بجا پلستر کے ٹکڑے پھیلے

نوعیات کا سلسلہ پرانی جاری رہتا تو فرات اور نیل عبور کر لینے والی قوم کے لیے دریائے رائن پار کر لینا چنداں دشوار تھا۔ ان کا بحری بیڑا بڑی آسانی سے دریائے ٹیز میں داخل ہو جاتا۔ جنگ تورز میں عیسائیوں کو شکست ہو جاتی تو آج آکسفورڈ میں بائبل کی بجائے قرآن پڑھایا جاتا اور کلیسا سینٹ پیٹرک پر صلیب کی بجائے ہلال نصب ہوتا۔ غلبہ جتنی اس جنگ کو زیادہ اہمیت نہیں دیتا۔ وہ کہتا ہے "جنگ تورز کسی صورت میں بھی فیصلہ کن نہ تھی۔ کینز کو صرف دو سال بعد مسلمانوں نے ایران اور نو سال بعد لی آن جیسے مشہور فرانسیسی شہر روند ڈالے۔ پھر ناربولن کی باری آئی جہاں سے گرفتار کئے گئے عیسائی مسجد قرطبہ کی تعمیر پر لگائے گئے۔"

رات کے پچھلے پہر تورز آیا۔ میرے ڈبلے کا دروازہ کھلا اور وہ جوان عورت آنکھیں ملتی ہوئی باہر نکل آئی۔

"تورز؟" اس نے جلدی سے پوچھا۔

میں نے سر ہلادیا۔

"ہاں" اس نے شرائط سے لب کیڑے اور ٹرین سے اتر کر پیٹ نام سے پسے تاریکی میں گم ہو گئی۔ اس کا سر میرے شانے کے ساتھ آگیا تھا۔ مسلمان تورز تک آپہنچے تھے۔ وہ مجھ سے پیچھے ہو کر تاریکی میں گم ہو چکی تھی۔ یورپ مسلمانوں کے قدموں میں تھا اور پھر ایک خواب تاریکی میں جذب ہو گیا۔ انجن نے وہیل دی اور گاڑی رینگنے لگی۔ بالکل آہستہ آہستہ جیسے آج سے پورے ۱۲۳۷ برس پیشتر مسلمان ایک سیاہ رات میں تورز سے روپوش ہو گئے تھے۔

گاڑی شیش سے باہر نکلی تو مجھے احساس ہوا کہ عربوں کے اندلس کی مدد یہاں سے شروع ہوتی تھیں۔ ان کی آمد سے قبل ہسپانیہ کا ایک صوبہ وہاں بسنے والی قوم وندال (کی مناسبت سے واندالیا یعنی وندالوں کا مکن

سے اینٹیں نظر آ رہی تھیں بڑھتے شب سفر کا بیشتر وقت راہداری میں کھڑے ہو کر گزرا تھا، اس لیے اب فیند آ رہی تھی۔ میں کھڑکی کے ساتھ ٹیک لگا کر اُدھنے لگا۔
”دیکھیے اگر آپ بڑا زمانہ تو ہم آپ کے ساتھ بیٹھ جائیں؟“ میں نے شکل اپنی فیند سے بھاری آنکھیں کھولیں تو سامنے ہسپانوی کسٹم آفیسر کی پسندیدہ امریکی لڑکیوں کو کھڑے پایا۔ وہ بکھرائی ہوئی نظر آ رہی تھیں۔ میں کسک کر کھڑکی کے ساتھ لگ گیا۔
اور وہ فوراً میرے برابر والی نشست پر براجمان ہو گئیں۔

میرے ساتھ بیٹھی ہوئی پستہ قد اور قابل رشک سہت کی مالک لڑکی نیلے رنگ کی چست پتلون اور کالے سویٹر میں جھوس تھی۔ سویٹر لمبائی میں چھوٹا ہونے کی وجہ سے پتلون تک پہنچتے پہنچتے رہ گیا تھا۔ وہ بار بار سویٹر کو دونوں ہاتھوں سے کھینچ کر سویٹر اور پتلون کے درمیانی فاصلے کو پر کرنے کی کوشش کرتی مگر ہاتھ اٹھاتے ہی جسم کے بلائی حصے کے کھپاؤ کی وجہ سے سویٹر سکڑ کر پھر اپنی پرانی حالت پر آ جاتا اور پتلون کی بلیٹ کے عین اوپر اس کا سفید پیٹ نظر آنے لگتا۔ دوسری لڑکی نے جس کا چہرہ قد سے لمبوتر تھا اپنے کندھوں پر ایک گیس فاشال اوڑھ رکھی تھی۔

دراصل ہیں ان ہسپانوی مزدوروں نے بے حد تنگ کر رکھا تھا۔ پستہ قد لڑکی نے قد سے توقف کے بعد کہا۔

”بلکہ..... دوسری نے اپنے جسم کا ایک حصہ سہاتے ہوئے منہ بنالیا۔
چٹکیاں بھی لیتے تھے۔“

”تو بے کے ایک کو نے میں چند ہنس مکھ فوجان ہسپانوی مزدور کھڑے دانت نکال رہے تھے۔ لڑکیوں کو میرے پاس بیٹھے دیکھ کر انہوں نے خوب ہانپو بچائی۔“

”دیے ان کا قصہ رہیں۔ پستہ قد لڑکی نے ہنس کر کہا۔ ”دوسرے گراموں لاکھوں سو میٹر لڑکیاں ہسپانیہ میں وارد ہو جاتی ہیں اور ان کے مقاصد اتنے ٹیک نہیں ملتے۔“

انہوں نے مجھے بتایا کہ وہ یورپ ریل پاس ”پرسفر کر رہی ہیں جو ایک ماہ کے لیے یورپ کے تمام ممالک میں بغیر معینہ سفر کے لیے کارآمد ہوتا ہے۔ یہ پاس صرف امریکی جاپانی اور کینیڈین باشندوں کو ہی مل سکتا ہے۔ میں یورپ میں ایسے بے شمار امریکیوں سے ملنا تھا جو ”یورپ ریل پاس“ پرسفر کر رہے تھے۔ وہ اپنے سفر کے اوقات کار کچھ یوں ترتیب دیتے تھے کہ صبح سویرے کسی بڑے شہر میں وارد ہوئے پورا دن وہاں گزارا اور پھر کسی ایسی گاڑی میں سوار ہو گئے جو تمام رات چلنے کے بعد صبح سویرے تک کسی اور خوبصورت شہر تک لے جائے۔ یوں وہ ہٹلوں میں رہائش کا خرچہ گاڑیوں میں سو کر بچا لیتے تھے۔ اگر ایک ہی شہر میں دو تین روز قیام کرنے کا ارادہ ہوا تو پھر ہر شام ٹیشن پر جا کر کسی بھی سمت جاتی ہوئی گاڑی پر سوار ہو کر سو گئے نصف شب کمیں اتر گئے اور مخالف سمت سے آتی ہوئی کسی اور گاڑی میں بیٹھ کر مزے سے سوتے ہوئے صبح سویرے واپس اسی شہر میں پہنچ گئے۔

ایرون سے سان باسٹیان تک سفر چالیس منٹ میں طے ہوا۔ دوران سفر ہسپانوی مزدور بڑی باقاعدگی سے لڑکیوں کو گھورتے رہے اور ان پر فقرے کہتے رہے۔ گاڑی کھڑی ہوئی تو میں نے اپنا سامان کندھے پر رکھا اور پلیٹ فارم پر اتر گیا۔ مجھے بے حد بخوک لگ رہی تھی اور میری جیب میں پچوٹا پیسہ بھی نہ تھا۔ میں نے ٹکٹ چیکر سے سفری چیک ہسپانوی کرنسی پیسہ میں تبدیل کروانے کے بارے میں دریافت کیا تو اس نے بتایا کہ کامیو یعنی کرنسی کا تبادلہ ریٹے ٹیشن میں واقع بانکو یعنی بینک سے ہو گا اور بینک تو نو بجے کھلے گا۔ میں نے گھڑی پر نگاہ ڈالی۔ ابھی صرف سات بجے تھے چنانچہ میں ریٹے ٹیشن کے ایک کونے میں سامان کا تیلہ سر کے نیچے رکھ کر لیٹ گیا۔ ابھی میں اُدھنے کی تیاری کر رہا تھا کہ وہ امریکی لڑکیاں پھر وارد ہو گئیں۔

”اب آپ کو کون تنگ کر رہا ہے؟ میں نے وہیں بیٹھے بیٹھے دریافت کیا۔“

بینک بند ہوتے ہیں۔

میں نے واپس آکر امریکی خواتین کو جب یہ دو ہنگو والا مژدہ سنایا تو ان کے چہرے بھی لٹک گئے۔ وہ بھی میری طرح "پچانک" تھیں۔

"میرے ذہن میں ایک ترکیب آئی ہے" چند لمحوں کی خاموشی کے بعد لمبوترے مژدہ والی نے شہادت کی انگلی کھڑی کر دی۔ "اکثر بڑے ہوٹلوں میں گاہکوں کی سہولت کے لیے کرنسی تبدیل کرنے کا انتظام بھی ہوتا ہے۔"

"بڑے ہوٹلوں میں؟" میں نے اپنی سیٹ پر نظر ڈالتے ہوئے کہا۔

"یہ بات بھی ہے" پستہ قد لڑکی نے مایوسی سے سر ہلایا۔ ہم تینوں کے پیچھے کھینچے اور پھر کچن لباس دیکھ کر شاید کوئی سچے درجے والا ہوٹل بھی ہیں اندر گھسنے کی اجازت نہ دیتا۔ لمبوترے مژدہ والی کی آنکھوں میں "گڈ" بھی لگی ہوئی تھی مژدہ ہاتھ دھونے کا موقع ہی نہیں ملا تھا۔

"بہر حال اب تو یہی طریقہ ہے" میں نے اپنا حینٹلا اٹھاتے ہوئے کہا۔ "ان دونوں نے بھی اپنا سامان اٹھالیا اور ہم شیش سے باہر آ گئے۔"

سان باسٹیان کی سفید عمارتیں دھوپ میں چمک رہی تھیں۔ شاید رات کو بارش ہوئی تھی۔ سڑکوں پر کہیں کہیں پانی کھڑا تھا۔ شہر کے درمیان میں ایک نر بہہ رہی تھی جس کے دونوں کناروں پر سرسبز درختوں کی قطاریں تھیں۔ ہم ایک خوبصورت پل پار کر کے دوسرے کنارے پر پہنچے گئے۔ تھوڑی دُور چلنے کے بعد ہسپانوی طرز کی سفید آہنی بالکونیاں اور شیشے کی بڑی فرانسسیسی کھڑکیوں والا ایک ہوٹل نظر آیا۔ ہم نے چپکے سے صدر دروازہ کھولا اور ہوٹل کے وسیع باغ میں سامان رکھ کر بڑے ٹھٹھے سے اندر داخل ہو گئے۔ کاؤنٹر کے پیچھے کالے سوٹ میں لمبوس ایک گنبا آدمی بڑے امنک سے نوٹ گنتے میں مصروف تھا۔ ہمارے بڑی عاجزی سے اپنا مَدعا بیان کیا تو اس نے فوراً نوٹ سمیٹ کر کاؤنٹر کے نیچے

"کوئی بھی نہیں!" پستہ قد لڑکی نے اپنا کالا سوئیر کیپتے ہوئے ہنس کر کہا۔ "ہم صرف یہ پوچھنا چاہتی ہیں کہ ہسپانوی کرنسی کہاں سے مل سکتی ہے؟"

"تشریف رکھیے۔" میں نے چکیلیے فرش پر ہتھیلی رکھ کر کہا۔ ہسپانوی کرنسی شیش کے بانکو سے ملے گی اور بانکو نو بجے کھلے گا۔ چنانچہ انہوں نے بھی میری تنقید کی اور سامان سر کے نیچے رکھ کر اُدھنے لگیں۔

نوبج گئے مگر بانکو نہ کھلا۔ شیش اب بالکل خالی پڑا تھا سوائے ایک خاکروب کے جو پچھلے دو گھنٹوں سے فرش کا ایک کونہ چمکا رہا تھا۔ میں اُٹھ کر اُس کے پاس پہنچا گیا۔

"سینور! میں نے خالی کاؤنٹر کی جانب اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔ یہ بانکو کتنے بجے کھلتا ہے؟"

اس نے مژدہ پچھا کر فرش پر ہتھوڑا اور پھر اس پر کپڑا جما کر کہنے لگا "کامیو؟" میں نے سر ہلایا۔ "ہاں چینگ؟"

"نو کامیو! نو بانکو! دو ہنگو!" اس نے گردان کی اور پھر سر جھکا کر فرش کو شیش پالش کرنے میں مصروف ہو گیا۔

پہلے دو لفظ تو میں ٹکٹ چیکر کی مہربانی سے سیکھ چکا تھا مگر اب یہ دو ہنگو جانے کس بلا کا نام تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے تمام ہسپانوی الفاظ کے اخیر میں "د" ضرور آتا تھا۔ میں نے فوراً کوٹ کی اندرونی جیب سے لندن سے خریدی ہوئی ہسپانوی، انگریزی ڈکشنری نکالی۔ دو ہنگو۔ دو ہنگو۔ میں نے لفظ دہراتے ہوئے جلدی سے ورق اُٹھائے۔ معلوم ہوا کہ دو ہنگو ہسپانوی میں اتوار کو کہتے ہیں۔

ہسپانیہ میں میری پہلی صبح کچھ اتنی دلاویز ثابت نہیں ہو رہی تھی۔ بھوک شیش سے باہر چمکتی دھوپ سے بھی زیادہ چمک رہی تھی۔ جیب میں ایک پینتہ نہ تھا اور کہیں سے ملنے کا امکان تھا کیونکہ آج اتوار تھا اور ظاہر ہے اتوار کو تمام

رکھ لیے اور پھر کسی قدیم گھڑیال کے پیٹھ پر لگا کر کسی صرف ہوٹل میں قیام پذیر گاؤں کے لیے تبدیل کی جاسکتی ہے۔

گنجنت اصلی ہسپانوی نہیں لگتا تھا کیونکہ میری ساتھی امریکی لڑکیوں نے نہ صرف اپنی مسکراہٹوں کا آزادانہ استعمال کیا بلکہ پستہ قد لڑکی نے اپنے برہنہ پیٹ کو سویر بھیج کر ڈھانسنے کی کوشش بھی نہ کی۔ ہم مایوس ہو کر باہر آنے کو تھے کہ میری نظر ڈائننگ روم میں بیٹھی دو انگریز لڑکیوں پر پڑی جو چائے پینے میں مشغول تھیں۔ انگریز اس لیے کہ یورپ میں چائے پینے کا تردد صرف یہی قوم کرتی ہے۔ میں ڈائننگ روم کا دروازہ کھول کر ان کے پاس چلا گیا۔ نہایت رونی شکل بنا کر اپنی بتا سانی اور ان سے التجا کی کہ وہ ہوٹل میں مقیم گاؤں کی حیثیت سے یہیں کرنسی تبدیل کرانے میں مدد دیں۔

”دوسرے کہیں کے؟ ایک مانی نے چائے کی پیالی میز پر پڑھ دی۔

”مظالم ہسپانوی“ دوسری مانی بسکٹ کھاتے ہوئے اپنا پلاٹا منہ چلانا بھول گئی اور وہ دونوں فوراً اٹھ کر میرے ساتھ کانٹری پر چلی آئیں۔

”ان بے چارے بچوں کے پاس خوراک خریدنے کے لیے بھی نہیں ہیں اور تم ان کے لیے کرنسی تبدیل نہیں کرتے پیڑرو کے بچے؟“

”لیکن سوائے گاؤں کے..... پیڑرو کے بچے نے لرزتے ہوئے اپنی صفائی میں کچھ کہنے کی کوشش کی۔

”کیا ہم گاؤں نہیں ہیں جو پچھلے برس روز سے تمہارے اس اصطبل میں قیام پذیر ہیں؟ کیوں ایلی ڈوئیر؟“

”ہاں باربرا ڈوئیر۔ اور میں روز میں سے سولہ دن بارش ہوتی رہی ہے۔“

پروٹی مانی نے ہاں میں ہاں ملائی۔

”اور ہمیں اس پیڑرو کے بچے نے یہ کلمہ کر بولایا تھا کہ اگست کے ان دنوں میں

یہاں موسم خوشگوار رہتا ہے اور سوچ چکتا رہتا ہے۔ کیوں ایلی ڈوئیر؟

”ہاں باربرا ڈوئیر۔ اس سے بہتر تھا کہ اپنی چھٹیاں لندن میں ہی گزار لیتیں۔“

”اور آج صبح ناشتے میں دیئے گئے انڈے کم از کم دو منٹ تک اُبلتے رہے ہوں گے۔ حالانکہ میں نے خاص طور پر ہدایت کی تھی کہ میرا انڈا صرف پرنے دو منٹ تک اُبالا جائے۔ کیوں ایلی ڈوئیر؟“

”جی وہ کرنسی..... اس سے قبیل کر ایلی ڈوئیر اپنے بلے ہوئے ٹورٹ کا رونا روتی میں نے کرنسی کا رونا رو دیا۔

”اوہو ہم تو بھول ہی گئی تھیں“ دونوں نے معذرت بھرے لہجے میں کہا اور پھر قہر آلود لہجے میں جہاں کہنے لگیں۔ ”پیڑرو؟“

پیڑرو وہی منجھ ہو گیا ”جی میڈم“

”ان بچوں سے سفری چیک لے کر انہیں ہسپانوی پیسے دے دو۔“

”جی میڈم“ پیڑرو نے کھٹ سے کہا اور فوراً ہم تینوں سے سفری چیک وصول کر کے ہمیں ہسپانوی پیسوں سے لا دیا۔ ہم مائیوں کا شکریہ ادا کر کے ہوٹل سے باہر جانے والے تھے کہ ایلی ڈوئیر نے ہمیں چائے کے لیے مدعو کر لیا۔ اس سے قبل کہ میں کچھ کہتا لمبو ترے منہ والی نے ”اوہ بہت بہت شکریہ“ کہہ کر دعوت قبول کر لی۔

”باربرا ڈوئیر“ پروٹی مانی کرسی پر بیٹھتی ہی اپنی سیلی سے مخاطب ہوئی۔

”کیا ہے ایلی ڈوئیر؟“ دوسری مانی نے ہمارے لیے چائے بناتے ہوئے پوچھا۔

”تم نے آج ناشتے پر صرف ٹوسٹ اور کمسن کھایا تھا؟“

”پھر؟“ مانی نے بسکٹوں کی پیٹ لڑکیوں کے آگے رکھتے ہوئے کہا۔

”پھر تھا۔ انڈا پرنے دو منٹ کی بجائے دو منٹ میں اُبالا ہوا کیسے ہو سکتا ہے؟“

”ہاں یہ تو ہے۔“ مانی نے اپنا بگلا سر کھجایا اور پھر کچھ سوچ کر کہنے لگی بڑے پچھلے

میں دوسری سولہ دن بارش بھی تو نہیں ہوئی۔ ہم تو صرف دس دن سے یہاں مقیم ہیں۔
 ”ہاں یہ بھی ہے۔“ پولی مائی ہنس دی اور پھر ہم سے مخاطب ہو کر کہنے لگی۔ میرا خیال ہے ہم بوڑھی ہو چکی ہیں۔“

جب ہم ہوٹل سے باہر نکلے تو ہماری پیسین لیسٹوں کے بوجھ سے اور ہمارے پیٹ چائے اور بسکٹوں سے بوجھل ہو رہے تھے۔ پستہ قدر کی کاسو میٹرز میڈیکل چکا تھا۔
 ”اب کیا ارادہ ہے؟“ پستہ قدر کی نے اپنی ساتھی سے دریافت کیا۔

”مجھے تو سان سبستیان سے وحشت ہونے لگی ہے۔ سٹیشن پر آویزاں ٹائم ٹیبل کے مطابق بارہ بجے ایک گاڑی میڈیٹرڈ کے لیے روانہ ہوتی ہے۔ اسی پر سوار ہو کر میڈیٹرڈ پہلے چلتے ہیں۔ راستے میں سو بھی لیں گے۔“

”ایک رات کے لیے سان سبستیان میں رُک جائیں تو کیا حرج ہے؟“ سوٹیر والی لڑکی نے میری جانب معنی خیز نظروں سے دیکھتے ہوئے مسکرا کر کہا۔

”ہاں کوئی حرج نہیں مگر پھر میں کیلی کیا کروں گی؟“

لمبرٹ سے سُننے والی نے ہنس کر کہا۔

”تم ٹھیک کہتی ہو۔“ دوسری لڑکی نے اپنا کلاس میٹر پتلون کے اوپر کھینچنے کی کوشش کرتے ہوئے مایوسی سے سر ہلایا اور پھر مجھ سے مخاطب ہو کر بولی۔

”اگر یہاں تمہارا کوئی اور دوست ہو تو آج شب ہم چاروں۔۔۔۔۔۔“

”یہاں سان سبستیان میں؟“ میں بے اختیار مسکرا دیا۔ ”بہر حال پیش کش کا شکریہ۔“

خدا حافظ! میں نے دونوں سے ہاتھ ملایا اور سامان اٹھا کر شہر کی جانب چل دیا۔

”میڈیٹرڈ میں ملاقات ہوگی۔“ کالے سٹریڈ والی کی آواز مجھ تک پہنچی۔ میں نے

چیخے دیکھے بغیر اپنا ہاتھ ہوا میں بند کر دیا۔

دس بج چکے تھے مگر سان سبستیان کے خالی کوچہ و بازار دیکھ کر خیال آتا تھا کہ شاید یہاں کے باشندوں کو ابھی تک طلوع آفتاب کا علم نہیں ہوا۔ میں

نے سامان کے قبیلے میں سے ”یوتھ ہوٹل“ بک نکال کر سان سبستیان کے یوتھ ہوٹل کا پتہ تلاش کیا اور پھر شہر کے مرکز کی جانب چلنا شروع کر دیا جہاں سے مجھے ہوٹل تک جانے والی بس منی چاہیے تھی۔ پلازا مینر سے ساحل کی جانب باقی ہوئی سڑک کے دور دیہ درختوں کی قطاریں تھیں جن کے تنے چڑے فٹ پاتھ پر قبوہ خانوں کے لازم کرسیاں اور میزیں سہارے تھے۔ کارپوشن کا ایک ٹرک سڑک پر چھڑکاؤ کر رہا تھا۔ کافی تلاش کے باوجود مجھے مطلوبہ بس سٹاپ نہ مل سکا۔ فٹ پاتھ پر کالے بالوں والی دوپستہ قد سپانوی لڑکیاں آپس میں باتیں کرتی ہوئی چلی آ رہی تھیں۔ میں نے انھیں روک کر یوتھ ہوٹل جانے والی بس کے بارے میں دریافت کیا۔ وہ دونوں پہلے تو غامض رہیں اور پھر مزہ پر ہاتھ دکھ کر ہنسنے لگیں۔ میں نے دوبارہ اپنا مدعا بیان کیا۔
 ”نوا انگلیس“ اُن میں سے ایک نے انگلیاں سچا کر کہا اور پھر دونوں اُسی طرح ہنسنی ہوئی آگے چل دیں۔ ایک خوش لباس راہگیر جس نے شاید مجھے لڑکیوں سے باتیں کرتے دیکھا تھا میرے پاس آکر سنایت شستہ انگریزی میں کہنے لگا۔ ”کیا میں آپ کی مدد کر سکتا ہوں؟“ میں نے بس سٹاپ کے بارے میں پوچھا تو وہ میرے ساتھ ہوا۔
 ”میں بھی اُسی جانب جا رہا ہوں۔ میرے ساتھ ساتھ چلے آئیے۔“ آپ شاید یورپ کی سیاحت کے بعد ہسپانیہ آ رہے ہیں۔ وہ کہہ رہا تھا۔ اُسی لیے راہ چلتی لڑکیوں سے راستہ دریافت کرنے میں جھجک محسوس نہیں کرتے۔ ہسپانیہ میں یہ بات انتہائی میوہ سمجھی جاتی ہے۔ ہم شمال میں رہنے والے اگرچہ جنوب کے نیم وحشی اندلیوں وغیرہ سے زیادہ تہذیب یافتہ ہیں مگر پھر بھی ہم ان نازک معاملوں میں اپنے ہاتھ فرانس کی تقلید نہیں کرنا چاہتے۔ ویسے بھی۔۔۔۔۔۔ اس نے اپنے دونوں لب سختی سے بیچھ کر کہا۔ ہم باسک ہسپانوی نہیں ہوتے۔“

”باسک؟“ میں نے اس کے چڑے چکے سینے اور سنہری بالوں کی طرف دیکھتے ہوئے حیرت سے کہا۔ ”باسک کون ہوتے ہیں؟“

اُس کے قدم وہیں رک گئے اور وہ میری طرف یوں دیکھنے لگا جیسے مجھ سے کوئی عظیم گناہ سرزد ہو گیا ہو۔

”آؤ گے ماریا! اس نے فوراً اپنا چھتا بائیں ہاتھ میں منتقل کیا۔ پرتھریم کا نام لے کر اپنے سینے پر صیب کا نشان بنایا اور پھر کہنے لگا ”باسک ایک ایسی نسل کا نام ہے جس کے خون میں ذرہ بھر ملاوٹ نہیں ہے۔ یورپ کی اعلیٰ ترین نسل سپانیہ میں رہنے والے تمام باشندوں کی رگوں میں تو کافر مغوروں کے خون کی آمیزش ہے لیکن کوہ پیرانیز کے دامن میں بنے والی ہماری قوم ہزاروں سال سے اپنے پرتھریم کی حفاظت کر رہی ہے۔ باسک جتنا محنتی، صحت مند اور مذہبی شخص آپ کو دنیا بھر میں منسلک گا۔ سپانیہ میں اگر کسی کو ایک ایسا نادر اور محنتی مزدور کی ضرورت پڑتی ہے تو وہ کتا ہے۔ ایک باسک لے آؤ! ہم اپنی تمام زمینیں اجتماعی طور پر کاشت کرتے ہیں۔ باپ کے مرنے کے بعد تمام جائیداد بڑے بیٹے کے نام منتقل ہو جاتی ہے جو پورے خاندان کی ضروریات پوری کرتا ہے اور اسی لیے ہم ان سپانیوں سے زیادہ خوشحال ہیں۔ اگرچہ کچھ لوگ ہمارا تقابل سکٹ لینڈ کے باشندوں کے ساتھ کرتے ہیں مگر یہ درست نہیں۔ ہم ان کی طرح اچھے کاریگر تو ہیں مگر کجس بالکل نہیں۔“

”وہ یوتھ ہوسٹل کو جانے والی بس کا شاپ..... میں نے ڈرتے ڈرتے اس کی بات کاٹ کر کہا۔

”بس شاپ؟ ہاں بس شاپ“ اس نے چلتا شروع کر دیا مگر یکچہر بھی جاری رہا۔ سپانیوں لوگ اور مرکزی حکومت ہمیشہ ہمیں شک کی نظروں سے دیکھتی ہے..... وہ آنکھ میچ کر مسکایا اور ان کی تشویش سمجھا ہے۔ ہم ایک علیحدہ قوم ہیں۔ ہماری زبان، ہمارے رسم و رواج اور عادات کا باقی سپانیہ سے دور کا بھی تعلق نہیں۔ آزادی کی تحریک شروع ہے۔ پیرانیز کے پار فرانس میں رہنے والے

باسک بھی ہماری مدد کر رہے ہیں۔ اگرچہ مرکزی حکومت نے تحریک آزادی کے سرکردہ رہنماؤں کو گرفتار کر رکھا ہے مگر ہم ایک نہ ایک دن آزاد باسک ریاست بنانے میں ضرور کامیاب ہوں گے۔“

بس شاپ اُنے تک اُس جیلے آدمی نے سوائے باسک نسل کی بڑائی اور عظمت کے کارنامے بیان کرنے کے اور کوئی بات نہ کی۔ بس آئی تو اس نے خاص طور پر کنڈکٹر کو ہدایت کی کہ وہ مجھے یوتھ ہوسٹل کے شاپ پر اتار دے۔

”اور ہاں“ اس نے بس کی کھڑکی سے جھانکتے ہوئے کہا ”میں معلوم ہے کہ جب فرانس کا بادشاہ شارلیمان کوہ پیرانیز عبور کر کے سپانیہ پر حملہ آور ہوا تو یہ باسک ہی تھے جنہوں نے مسلمانوں کے ساتھ مل کر وہاں سے ڈو میں اس کا بھڑکس نکال دیا۔“ خوش قسمتی سے کنڈکٹر نے فوراً ہی وہیل دے دی۔ اور میں باسک نسل کی عظمت کے بارے میں مزید معلومات حاصل کرنے کی سعادت سے محروم ہو گیا۔

سان سباستیان کا یوتھ ہوسٹل شہر سے باہر ایک ہرے بھرے پہاڑ کے دامن میں واقع تھا۔ میں نے دادوآن کے پاس اپنا کارڈ جمع کر دیا اور اندر چلا گیا۔ مکرے میں چھ بستر تھے جن میں سے ایک پر کچھ مونیچوں والا ایک نوجوان لڑکا سو رہا تھا۔ میں کپڑے بدلنے کی نیت سے سامان کا تھنیا کھولنے کو تنکا کو دروازے پر دستک ہوئی اور ساتھ ہی ایک ہاتھ میں لمبا برش اور دوسرے میں پانی کی بالٹی تھامے ہوسٹل کے کمرے صاف کرنے والی ایک محترمہ مکرے کے اندر آ گئی۔ اس نے بالٹی زمین پر بٹخنی، میری طرف دیکھ کر ناک چڑھائی اور انگوٹھے کو غم سے کوزہ دار کی طرف اشارہ کر دیا۔ یعنی باہر دفع ہو جائو۔ میں کمرے سے باہر آیا تو وہ کچھ مونیچوں والا نوجوان بھی آنکھیں مٹا میرے پیچھے پیچھے چلا آیا۔

”کیا آپ بھی سپانیہ کی سیاحت پر نکلے ہوئے ہیں؟“ میں نے یونہی پوچھا۔

”نہیں نہیں۔“ اس نے مونیچوں کو بل دیتے ہوئے سنجیدگی سے کہا۔ میں

وقت ہے۔ سی انسا!

”سان باسٹیان دیکھنے کے لیے میرے پاس صرف آج کا دن ہے۔“ میں نے مردی کبیرہ گھٹے میں ڈالتے ہوئے کہا۔ میں شاید کل صبح پاپولنا چلا جاؤں۔“

”گرمی بہت ہے۔ بہر حال ساحل کی جانب چلے جاؤ وہاں خوب رونق ہوگی بروننگ کا شیڈوم بھی ساتھ لیتے جانا۔“

میں نے اس کے مشورے پر عمل کرتے ہوئے اپنا سوئنگ کا شیڈوم جو سوئڈن کی ایک جمیل میں تر ہونے کے بعد اب تک پڑا سوکھ رہا تھا ایک تولیے میں لپیٹ کر بغل میں دبایا اور ہوٹل کے باہر کھڑی ہوئی بس پر سوار ہو کر سان باسٹیان کے مشہور ساحل سمندر کو نچا کے قریب اتر گیا۔

نیچھی مونچھوں والا درست کتا تھا۔ یہاں خاصی رونق تھی۔ چند ایک ہسپانوی لڑکیاں ریت پر بیٹھی سوئیرن رہی تھیں اور وہ نہانے کے لباس کی بجائے اپنے روزمرہ کے لباس میں ملبوس تھیں۔ البتہ خوش شکل ہسپانوی لڑکوں کی ٹولیاں شکاڑ کی تلاش میں ادھر ادھر گھوم رہی تھیں۔ اور شکاڑ فرانسیزی لڑکیاں تھیں جو نہانے کا مختصر ترین لباس بکینی زیب تن کیے ریت پر لیٹی اپنے متناسب جسم سولا رہی تھیں۔ بکینی چار گروہ کپڑے کے ان دو ٹکڑوں کا نام ہے جو ستر پوشی کے اصول حدود الگ باندھ کے رکھا ہے جو مال اچھا ہے پر عمل پیرا ہوتے ہوئے جسم کے ایک حصے میں اور دوسرے پر اشکال لیے جاتے ہیں۔ بکینی کے بالائی حصے کی پتلی ڈوری کی گروہ شاید صرف قرب ارادی کی بنا پر قائم تھی ورنہ اس میں سورت کی مضبوطی کا چنداں دخل نہ تھا۔ چند برس پیشتر مذہبی وجوہات کی بنا پر ہسپانیہ کے ساحلوں پر اس قسم کا لباس پہننے پر کڑی پابندی عاید تھی۔ خلافت و رزی کرنے والے کو بلکہ والی کو ہسپانوی کی پولیس ”گارڈیا سول“ دھرم لیتی اور جرمانے کے ساتھ دیس نکالا بھی ملتا۔ اس پابندی کا اثر یہ ہوا کہ سکینڈے نیویا اور فرانس کی آزاد منش سیاح خواتین نے اپنے جسم کا زیادہ تر

توسان باسٹیان میں ہی رہتا ہوں۔ اتوار کے روز میری بیوی مجھے پہلی جاتی ہے اور ہمارے آٹھ بچے گھوڑوں وہاں چمچاتے ہیں کہ خدا کی پناہ۔ چنانچہ میں ہوٹل میں آکر سوتا ہوں۔ یہاں سوائے اس کمرے صاف کرنے والی کے اور کوئی میرے سکون میں دخل نہیں ہوتا۔ پرپ اگر خاندانی منصوبہ بندی کی اجازت دے دیتا تو میری زندگی میں اجیرن نہ ہوتی۔ تمہارے کتنے بچے ہیں؟“

”میں بے شادی شدہ ہوں۔!“

”کسی کیتھولک لڑکی سے شادی مت کر بیٹنا۔ اہ!“ اس نے اُدگتے ہوئے مجھے خبردار کیا۔

ادھر وہ ہسپانوی چوڑی کمرے کی صفائی پر دھیان دینے کی بجائے اپنے گلے کے کمال کا مظاہرہ کرنے میں مصروف تھی۔ بستر تو اجنبی طور پر بھاڑتی گرم کھول کر تانیں خوب لگاتی۔ تقریباً ایک گھنٹے کے بعد جب اس کا گلابیٹھنے لگا اور لا۔ لا کی بجائے لا۔ لا۔ آ۔ آ کی آوازیں برآمد ہونے لگیں تو اس نے کمرے کی صفائی مکمل ہونے کا اعلان کر کے ہمیں اندر آنے کی اجازت دے دی۔ میں اپنے بستر پر بیٹھ کر سامان کھولنے لگا تو وہ ایک سٹول کچن کر میرے پاس بیٹھ گئی۔ کہاں سے آئے ہو؟ کتنے روز ٹھہرو گے؟ ایک سگرٹ تو پلاؤ۔ سگرٹ دیا تو اپنے پچوں اور خاندان کے بارے میں تفصیلات بتانے لگی۔ میں نے بڑی مشکل سے رخصت کیا اور کپڑے بدل کر بستر پر لیٹ گیا۔

میری آنکھ کھلی تو دونوں کمرے تھے شہر جانے کے لیے تیار ہو تو نیچھی مونچھوں والے صاحب کی آنکھ بھی کھل گئی۔

”کہاں جا رہے ہو؟“ اس نے جہائی لیتے ہوئے پوچھا۔

”شہر کی جانب“

”شہر؟“ اس کی جہائی وہیں منجمد ہو گئی اس وقت۔ دو بجے؟ یہ تو ستانے کا

حصہ سرفلانے کی خاطر ہسپانیہ کی بجائے اطالیہ اور لیونان کے ساحلی مقامات کی جانب کوچ کرنا شروع کر دیا۔ ان ہردو ممالک میں لباس پر ایسی کوئی پابندی عاید نہ تھی بلکہ وہاں کے فوجی لباس اور زیب تن کے درمیان زیب کی غیر موجودگی زیادہ پسند کرتے تھے۔ چنانچہ مالی مصلحتوں نے مذہبی جذبات پر غلبہ پایا اور حکومت ہسپانیہ نے یہ پابندی اٹھال۔ اب غیر ملکی لوگیاں صرف دودو دریاں نیچے اوپر الٹا کر کھلے بندوں ساحل پر دھوپ سیکتی ہیں اور ان ڈسکی آن ڈسکی لوگوں کو دیکھ کر ہسپانوی فوجان اپنی آنکھیں گرتے ہیں۔ میں سڑک کے ساتھ سیڑھیوں سے اتر کر ساحل پر آیا اور پھر حفاظتی بند کے ساتھ ایک لکڑی کے کھوکھے میں لباس تبدیل کر کے سمندر کے قریب مہیت پر لیٹ گیا۔

سمندر ایک آبائے کی صورت میں شہر کے درمیان کو سچا بیچ تک چلا آیا تھا۔ آبائے کے دونوں سروں پر اگڈو اور ارگل نامی دوسرے پہاڑیاں کھڑی تھیں۔ ان پہاڑیوں کے درمیان سائنٹا کلارا کا خوبصورت جزیرہ دکھائی دے رہا تھا جس کی چھوٹی سی بندرگاہ میں پھیروں کی چند کشتیاں جمبول رہی تھیں۔ اگڈو پہاڑی پر واقع قلعہ کے حفاظتی برجوں کا رخ سمندر کی جانب ہے اور یہ ان دنوں کی یاد دلاتا ہے جب بھری قزاق سان بستیان پر حملہ آور ہوا کرتے تھے۔

سان بستیان ہسپانیہ کے صوبے باسک کے علاوہ ایک کارگاہی صدر مقام بھی ہے۔ گرمیوں میں جب میڈرڈ چھینے لگتا ہے تو آبادی کی اکثریت سان بستیان کا رخ کر لیتی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ گرمیوں میں صرف وہی لوگ میڈرڈ میں رہتے ہیں جو سان بستیان جانے کی توفیق نہیں رکھتے۔ شہر کی فرانسیسی طرز کی عمارتوں، گرد و نواح کے سرسبز پہاڑوں، کو سچا بیچ کی گھاگھی اور خوشگوار موسم نے قاضی ولی محمد جیسے سکے بند بزرگ کو بھی بے حد متاثر کیا تھا۔ یہاں میں قاضی صاحب کا مختصر تعارف کروا دینا ضروری سمجھتا ہوں کیونکہ کتاب کے آئندہ اوراق میں بھی ان کا ذکر آئے گا۔ عالی جناب میرزا بیگہ منی ولی محمد صاحب سیکرٹری رد لکاری خاص اعلیٰ حضرت فرمانروائے جمہور

ذوالعز و البلال دسکریٹری محکمہ نشر و اشاعت محکمہ مالیہ اسٹیٹ کونسل دارالاقبال بمبئی نے آج سے ۵۵ برس پیشتر ہسپانیہ میں قدم رنج فرمایا اور ہندوستان واپسی پر سفر نامہ اندلس ترتیب دیا۔ قاضی صاحب وضع دار قسم کے بزرگ تھے۔ اڈل تو موٹر گاڑی میں سفر کرتے اور اگر کہیں نصیب دشمن ٹرین میں سوار ہونا پڑتا تو درجہ اول میں بھی انہیں کوفت ہوتی۔ شہر کے بہترین ہوٹل میں قیام پذیر ہوتے اور اٹھتے بیٹھتے سرکار برطانیہ کی نمک خوری پر نازاں "خدا سر سبز رکھے گلزار انگشیر کو" کا ذکر کرتے۔ قاضی صاحب نے آج سے نصف صدی قبل منصف العری اور نازک مزاجی کے باوجود اسلامی تاریخی مقامات اور عمارتوں کی تلاش میں ہسپانیہ کا کوزہ چھان مارا۔ جہاں ان کا انداز بیان بے حد شگفتہ ہے وہاں ان کی تاریخی بصیرت بھی حیران کن ہے۔ جس بھی ان کے سفر نامہ اندلس کی ورق گردانی کرتا ہوں تو مجھے اپنی کم مائیگی کا شہت سے احساس ہونے لگتا ہے۔ "اندلس میں اجنبی" ایک کھلندر ہے۔ لا پرواہ اور کم علم سیاح کی آواز گردی کی داستان ہے۔ مگر قاضی صاحب کا "سفر نامہ اندلس" ایک محقق اور صاحب علم ہستی کی سیاحت کا پتوڑ ہے جس میں ہسپانیہ کے شہروں دریاؤں، پھیلوں، پھولوں، ذراعت، موسم، ریل، گداگروں، خانقاہوں اور قناروں سے لے کر چراہوں اور موڈی جانوروں تک کا ذکر ملتا ہے۔ وہ سفر نامے کے آغاز میں لکھتے ہیں "میں نے ۱۹۲۴ء کا سفر یورپ محض اندلس کی سحرانوردی کے لیے کیا تھا۔ یہ اوراق پریشاں سامان دکشتی سے متعرا ہیں۔ تجارت کی گرم بازاری، مجالس کی دلفریبی، رقص و سرود کی بزم آرمیاں دیکھنا مقصود ہو تو فرانس اور لندن کے سفر نامے کو دیکھو۔ اندلس میں راقم الحروف نے سب سے جداگانہ راستہ اختیار کیا ہے جو بجائے تعمیر، باغات، عمارات، بازارات، میلہ مناظر تعزیر کے ہمیشہ پرانے کھنڈروں کی طرف جانکلا ہے۔ ہر شہر کے شکستہ و ریختہ آثار اسلامی کا ہلکا سا نقشہ ناظرین کے سامنے پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ دلچسپ مقامات کی سیر کے لیے کافی فرصت

دو چتر۔ ایک مستنصر اور ایک بوڑھا رہ گئے۔ میں نے بوڑھے سے جو میرے قریب ہی اونٹھے
مڑ لٹا اونگھ رہا تھا اس ہجرت کا سبب پوچھا۔ اس نے بشکل آنکھیں کھول کر اپنی کلائی
پر بندھی گھڑی پر نگاہ کی اور پھر جیسے اسے کچھ نہ کھا لیا ہو۔

”کو ریڈا۔ کو ریڈا“ اس نے دونوں ہاتھ بے قراری سے ہوا میں لہرائے اور
جلدی سے اپنا سامان سمیٹ کر وہاں سے چل دیا۔

مجھے یاد آیا کہ میرے کسے تموہ غارت گال۔ میں ایک امریکی نے مجھے یہ بتا کر دیکھ میر
میں ڈال دیا تھا کہ وہ ہر اتوار باقاعدگی سے سان باسٹیان صوفت اس لیے جاتا
ہے کہ وہاں کے بل رنگ میں ہسپانیہ کے بہترین بل فائٹرز اپنے جوہر دکھاتے ہیں۔
آج اتوار تھا اور چار بج رہے تھے۔ ”کو ریڈا“ یعنی بل فائٹ شروع ہونے کو تھی۔
میں نے جلدی سے سمندر کے ٹیکس پانی میں ایک ڈبکی لگائی۔ پھر باہر نکل کر تازہ
آب شرب میں غوطہ لگا کر کپڑے بدلے اور ساحلی سڑک کو پار کر کے شہر کی جانب
چل دیا۔ بل رنگ کا راستہ دریافت کرنے کی چندال ضرورت نہ تھی۔ سان باسٹیان کے
باشندوں کی اکثریت ایک ہی جانب رہاں تھی۔ یوں گتا تھا جیسے کہیں شیرینی بٹری
ہے اور لوگ اپنا حصہ لینے جا رہے ہیں۔ اکثر لوگوں کے ہاتھوں میں آج کی بل فائٹ
کے بارے میں تفصیلی کتابچے تھے۔ آج کی فائٹ میں لڑنے والے تین بل فائٹروں کے
زندگی کے حالات۔ مقابلے میں آنے والے بل کس کس فائدہ پر پلے ہیں؟ کونسی نسل سے
تعلق رکھتے ہیں؟ وغیرہ۔

سان باسٹیان کا بل رنگ شہر سے باہر سمندر کے کنارے ایک ٹیلے پر واقع
ہے۔ بل رنگ کے سامنے اتنا زبردست جہوم تھا کہ بل رنگ کی پہلی منزل دکھائی
نہیں دے رہی تھی۔ ٹکٹ گھر کے باسے میں جس کسی ہسپانوی سے پوچھا وہ اپنی زبان
میں کوئی لچھے دار فقرہ کہہ کر غائب ہو جاتا۔ بل فائٹ شروع ہونے میں صرف چند
منٹ باقی تھے اور ہر شخص اسی کوشش میں تھا کہ جلد از جلد ٹکٹ خرید کر بل رنگ

اور اطمینان کی ضرورت ہے۔ ایک ملازم چٹہ۔ غریب الدیار ناد اقف تیاح چار ماہ کی قلیل
مدت میں اس سے زیادہ اور کیا کر سکتا تھا۔

۷۔ گمشدگی میں پھروں کو سیر صحرا دیکھوں یا سعدن کوہ و دشت و دریا دیکھوں
ہر باتری قدرت کے لاکھوں جلوے جہاں ہوں کہ دو آنکھوں سے کیا دیکھوں
آئندہ اوراق میں قاضی صاحب بھی میرے ہمراہ ہوں گے۔ اُمید ہے آپ ان کے
طرز بیان اور وضع داری سے لطف اندوز ہوں گے۔ سب سے پہلے تو سان باسٹیان
کے بارے میں ان کے تاثرات سنیے۔ لکھتے ہیں:-

”سنت سبشین کا شہر ہلالی شکل میں آباد ہے۔ دونوں گوشوں پر ٹیکرے آگئے
ہیں۔ وسط میں ایک ٹیکرہ سمندر میں مثل جزیرہ آگیا ہے۔ ساحل سمندر پر زن و مرد
نیگول ریشمی جاکٹیں پہنے دوڑتے جاگتے۔ اُچھلتے کودتے چمک بلیہ کھیتے پھرتے
ہیں۔ جب تھک جاتے ہیں تو وہیں زمین پر لیٹ جاتے ہیں۔ سمندر میں تیرتے
ہیں اور باہر نکل کر تازہ آب شیریں میں غوطہ لگا کر لباس بدلتے ہیں۔ صندل زن و مرد
کا روزانہ صبح و شام یہی شغل ہے۔ فرصت ہونی تو ٹیکس کے لیے نکل گئے یا قرض خانہ
میں جا کر محو لکب خرامی ہو گئے۔ غرضیکہ ہر شخص بے فکر و بدست ہے۔“

آج پچیس برس بعد بھی سان باسٹیان کے ساحل کا نقشہ انہی الفاظ میں کھینچا
جا سکتا ہے۔ دونوں گوشوں پر ٹیکرے یعنی اکھڑا اور ارگل کی پہاڑیاں۔ درمیان میں ایک
ٹیکرہ سمندر میں مثل جزیرہ یعنی سانتا کلارا۔ اس وقت بھی میرے سامنے زن و مرد
ریشمی جاکٹیں پہنے دوڑ جاگ رہے تھے۔ شاید یہ چمک بلیہ بھی کھیل رہے ہوں۔ بوقت
سے نہیں کہہ سکتا۔ کیونکہ میرے فرشتوں کو بھی خبر نہیں کہ یہ چمک بلیہ کیا جاکٹ ہے۔

پونے چار بجے کے قریب لوگوں نے ساحل سے اٹھنا شروع کر دیا۔ یوں گتا تھا
جیسے یا تو ان سب کو یکدم کوئی ضروری کام یاد آگیا ہے اور یا پھر سامنے والے سانتا کلارا
جزیرے میں انہی دھماکے کا تجربہ ہوا چاہتا ہے۔ چار بجے تک پوری کو سچا بچ پرموت

کے اندر بہترین نشستوں پر قبضہ جمائے غاصی ویرادھر اُدھر دھکے کھانے کے بعد ایک بڑی اماں کو میرے حال پر ترس آگیا اور اس نے مجھے ٹکٹ گھر تک پہنچا دیا۔ اسی پیتے والے ٹکٹ کے حصول کے لیے باقاعدہ و حکم پیل جاری تھی۔ چونکہ لاہور کے سیناؤں میں ٹکٹ خریدتے وقت ایسے دشوار مراحل سے کئی مرتبہ سرخرو ہو کر نکلا تھا اس لیے میں نے سوچتے کا ایک نوٹ مٹھی میں دبا اور خالص لاہوری انداز میں "ایلی" کا نعرہ لگا کر صفیں چرتا ہوا کھڑکی تک جا پہنچا۔ میری مٹھی جب ٹکٹ فروخت کرنے والے کی ناک کے عین سامنے کھلی تو اس ظالم نے آنکھیاں سچا کر ٹکٹ ختم ہونے کا اعلان کر دیا۔ اب اس کے علاوہ اور کوئی چارہ نہ تھا کہ ایک سو میں پیتے والا نسخہ خرید اجائے۔ بیل رنگ کے گردبنی ہوئی راہداری سے بالائی منزل تک لکڑی کی سیڑھیاں جا رہی تھیں۔ پہلی منزل پر ٹکٹ دکھایا تو گیٹ کیپر نے مُنہ بنا لیا اور اُنکی کھڑکی کر کے اوپر کی طرف اشارہ کر دیا۔ دوسری منزل پر بھی یہی حشر ہوا۔ بالآخر تیسری منزل پر قسمت نے یادری کی اور میں تماشائیوں کے ایک ریٹے کے ساتھ بیل رنگ کے اندر پہنچ گیا۔

ہے تورو

سان سباستیان کے یونانی تھیٹر فائبل رنگ میں ہزاروں تماشائی دم سادھے بے حس و حرکت بیٹھے تھے۔ ان سب کی نظریں ایک نقطے پر جمی تھیں۔ ایک ایسا نقطہ جس کی زد میں ایک سُرخ چھانک اور اس کے کواڑ پر ہاتھ رکھے ایک بوڑھا آیا ہوا تھا۔ میری نظریں بھی اُسی ایک نقطے پر لگی ہوئی تھیں۔ بہر طرف مکمل خاموشی تھی۔ بیل رنگ کا نصف حصہ سائے میں تھا اور بقیہ نصف حصے پر تیز دھوپ چمک رہی تھی۔ بیل رنگ کی بالائی منزل کو جہاں میں بیٹھا تھا اسلامی طرز تعمیر کی خوبصورت محرابیں گھیرے ہوئے تھیں۔ سورج کی کرنوں سے متور نصف حصے میں واقع محرابوں کا سُرخ رنگ نہایت شوخ لگ رہا تھا۔ سُرخ رنگ جو بیل ٹائٹ کا نمایاں رنگ ہے.....

سُرخ محرابیں۔ سُرخ رُومال۔ سُرخ دروایاں اور پھر سُرخ خون..... اکثر اوقات بیل کا اور کبھی کبھار انسان کا..... بیل ٹائٹ کا۔ بیل رنگ کے درمیانی میدان کی سطح پر پچھی ریت نہایت ہموار تھی۔ میدان بالکل خالی پڑا تھا۔ چند لمحوں میں یہاں موت کے سائے روشنیوں کا پیچھا کرنے والے تھے۔ میں اپنے ارد گرد بیٹھے ہزاروں لوگوں کی طرح ایک ایسے ڈرامے سے پردہ اٹھنے کا منتظر تھا جس میں دو پہر کی دھوپ، شام کے سائے، گرم ریت، ایک حیوان اور ایک انسان مرکزی کردار ادا کرنے والے تھے۔ انسان یہ ثابت کرنے کے لیے کہ اس میں موت کے سائے

بل کے میدان کے درمیان میں کھڑے ہوتے ہی یہ مکمل سکوت کچھ یوں ٹوٹا کہ کان پڑی آواز سناؤں نہ دے رہی تھی۔ یہ توڑ ہے توڑ ہے توڑ۔ "تماشا ٹی اپنے رُومال، ہیٹ اور پنکھے ہلا ہلا کر اُسے اپنی جانب متوجہ کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ میرے قریب بیٹھے ہوئے دو موٹے ہسپانوی میدان میں کھڑے بل کے بارے میں بحث کرنے لگے۔

"بل شکل سے تو 'برارتو' یعنی بہادر لگتا ہے۔"

"نہیں مجھے تو 'آران کاوا' یعنی قد سے بڑا دل معلوم ہوتا ہے۔"

اگلی نشست پر بیٹھی ایک بڑھیا نے مڑ کر دونوں کو ڈانٹ پلائی "برارتو یا

آران کاوا نہیں ہے صرف مانسو یعنی غصیللا ہے۔"

سب پڑی اہل تھیں تو معلوم ہوتا چاہیے کہ وہ برارتو نہیں ہے کیونکہ بل کی بہادری اس کی ماں پر منحصر ہوتی ہے۔ اُدھر سے جواب آیا۔ پاس بیٹھے ہوئے لوگ ہنسنے لگے۔ بڑھیا نے بھی بل کی ماں کا خطاب ملنے پر بالکل براہ مانا۔

بل جو پہلے سر اٹھائے ہوئے بڑے اعتماد سے چاروں طرف دیکھ رہا تھا بلبک کے شور مچانے پر قد سے گھبرا گیا ہزاروں آوازوں کا شور ہے توڑ ہے توڑ۔ اس نے بل رنگ کے چاروں طرف دیکھا۔ اپنے پچھلے سٹم ریت میں رگڑے اور پتے ہوئے میدان کے درمیان سر اٹھا کر مقابلے کے لیے تیار ہو گیا۔ زیر افتاد و ناقابل تسخیر بل فائننگ ہسپانوی تہذیب و ثقافت کا ایک ایسا جڑ ہے جس کے بغیر ہسپانیا کا وسیع کیزس بے رنگ ہو کر رہ جاتا ہے۔ غیر ملکی اسے بربریت سے بھرپور وحیاد اور ظالمانہ قرار دیتے ہیں۔ جلال کھیل میں ہر بار چھ بیٹھے ہاک ہول مبتعد گھوڑے زخمی ہو جاتے اور کبھی کبھار انسان بھی مارا جائے اُسے کھیل کیسے کہا جاسکتا ہے۔ اُدھر ہسپانوی بل فائننگ کو موسیقی، رقص اور مصوری کی مانند فنون لطیفہ کی ایک شاخ قرار دیتے ہیں۔ بربریت کے الزام کے جواب میں وہ امریکی فٹ بال اور

سینہ سپر ہونے کی صلاحیت موجود ہے۔ وہ اب بھی لاکھوں برس قبل جنگوں میں رہنے والے اپنے آباؤ اجداد کی مانند ایک جنگی ورندے کے سامنے اکیلا ٹھکر ٹھکر کر کھڑا ہو سکتا ہے اور اُسے اپنی قوت بازو سے زیر کر سکتا ہے۔ اور حیران..... یہ ثابت کرنے کے لیے کہ انسان یہ جنگ جیت بھی لے تو کیا۔ یقینی موت کا سامنا بے جگری سے کرنا ہی جرأت کی معراج ہے۔

ہر سو مکمل سکوت تھا۔ میں ٹکڑی کی سخت نشست پر بیٹھا نیچے سُرخ درازے پر نظریں جھانکے ہوئے تھا۔ اچانک بگل کی تیز آواز بل رنگ میں گونج گئی۔ بڑھے نے دائیں ہاتھ سے اپنا پسیدہ ہیٹ اتار کر ماتھے کا پسینہ پونچھا، پھر بائیں ہاتھ سے اسٹبل کا سُرخ پھانک زور لگا کر دھکیلا اور پھر بڑی پھرتی سے پیچھے ہٹ گیا۔ چپڑوں میں ایک بھاری بھر کم سیاہ بل بگل کی سی تیزی کے ساتھ اسٹبل میں سے سر پیٹ وڑتا ہوا اکھاڑے میں داخل ہو گیا۔ اس مکمل سکوت میں اس کے طاقتور ٹموں کی دھمک تیسری منزل پر بھجنا تک پہنچ رہی تھی۔ اس کے بوجھ تلے بل رنگ کی زمین لرز رہی تھی اس نے میدان کا ایک پکر لگایا۔ شکار کی تلاش میں اُدھر اُدھر نگاہ دوڑائی۔ میدان عالی نظر آیا تو ٹکڑی کی اونچی گیلری پر حملہ آور ہوا۔ گیلری کے پیچھے بیٹھے ہوئے چند تاشیلوں کی چیخیں نکل گئیں۔ دو پار ٹکڑوں کے بعد جب بل کو احساس ہوا کہ وہ گیلری توڑ کر تاشیلوں تک نہیں پہنچ سکتا تو بھاگتا ہوا میدان کے درمیان میں اکھڑا ہوا طاقتور مغرور اور ہسپانوی زبان میں "زیر افتاد" یعنی ناقابل تسخیر۔ اُس کو اپنے آپ پر اعتماد ہے کہ وہ اپنے راستے میں مائل ہونے والی ہر شے کو فنا کر دے گا۔ کیونکہ اس میں ایک اچھے بل کی تمام خاصیتیں موجود ہیں۔ مضبوط مرنی کمال۔ چمکتی آنکھیں۔ چوڑا منہ۔ سٹم اور سر چھوٹے۔ موٹی گردن جس پر گوشت کی تہیں جمی ہوئی نہیں۔ چوڑے کانٹھے۔ دم لمبی اور پتلی اور پھر اس کا خطرناک ترین ہتھیار سیٹنگ جو آگے کی طرف مڑے ہوئے تھے۔ ایک اعلیٰ اسل بل کی جو بہترین بل فائننگ کے لیے موزوں ترین تھا۔

ہانگ کی مثال پیش کرتے ہیں۔ ان ہر دو کیوں میں مرنے والوں کی تعداد بل فائنگ میں ہلاک ہونے والوں سے کہیں زیادہ ہے۔ پھر بل فائنگ ظالمہ کھیل کیسے ہو گیا اور اگر ہر بھی تو ہسپانویوں کے نزدیک اتنی ڈھیر سادی خوبصورتی کے لیے متور اساطیر بھی جائز ہے اور جہاں تک فائنگ کا تعلق ہے وہ جائیں جہاں ہیں۔

ہر ہسپانوی بل فائنگ کو اپنے مخصوص نقطہ نظر سے پرکھتا ہے۔ چند ایک کے لیے یہ جذباتی مسئلہ ہے۔ ان کی تمام ہمدردیاں بل فائنگ کے ساتھ ہوتی ہیں اور انہیں ان کے نعرے بل کے لیے۔ کچھ لوگ اسے اپنے مذہبی جذبات کی تسکین کا ذریعہ بناتے ہیں کیا بل فائنگ کا اندازہ "دیرونیکا" سینٹ دیرونیکا کے نام پر نہیں جس نے رومال سے حضرت عیسیٰ کے پیرے سے پسینہ پونچھا تھا؟ چند ایک کے لیے یہ انا کا مشن بن جاتا ہے۔ میدان میں کھڑا بل فائنگ ایک ہسپانوی ہے اور اس کے سامنے سرنگوں بل وینا کی تمام دوسری قوتیں کچھ لوگ بہ صورت بل فائنگ کو ہلاک ہوتا ہوا دیکھنے کی قتلے کر آتے ہیں۔ بہر حال وجوہات کچھ بھی ہوں بل فائنگ ایک ایسا کھیل یا فن ہے جس کے بغیر شاید ہسپانوی روح مردہ ہو جائے جس طرح خوبصورت موسیقی سے لطف اندوز ہونے کے لیے ذوق کے ساتھ ساتھ موسیقی کی رمزی جاننا از حد ضروری ہے اسی طرح بل فائنگ کو سمجھنے اور پسند کرنے کے لیے اس فن کے بارے میں چند بنیادی باتیں جاننا بھی انتہائی اہم ہے ورنہ پہلی بار اس کھیل کو دیکھنے والے قماشانی کو شاید بل فائنگ صرف ایک ظالم قصاب کی صورت میں نظر آئے جو غریب بل کو ہلاک کر کے عوام سے داد وصول کرتا ہے۔

بل فائنگ کے پیشے کی دلکشی شہرت، عزت اور دولت ایسے عناصر ہیں جو ہزاروں ہسپانوی نوجوانوں کو ہر سال اپنی طرف کھینچ لاتے ہیں۔ جیسے ہمارے ہاں اکھاڑوں میں استاد پہلوان نوجوان لڑکوں کو دائرہ چھیٹکھاتے ہیں اور ان میں سے مہم دمے چند ہی اس پیشے کی بندلیوں پر پہنچ پاتے ہیں۔ ایسے ہی ہسپانیہ کے اکثر

شہروں میں بل فائنگ کے باقاعدہ سکول ہیں وہاں سے کامیاب ہونے والے ایک ہزار نوجوانوں میں سے ہر ایک ایک سو کسی چھوٹے موٹے بل فائنگ میں داخل ہوتے ہیں اور ان میں سے دو چار ہی پیشہ ور بل فائنگ بننے میں کامیاب ہوتے ہیں اور پھر ہزاروں پیشہ ور بل فائنگوں میں سے ایک دو شہرت کی اُن بندلیوں کو پہنچتے ہیں جن کی کشش انہیں اس پیشے میں کھینچ لاتی تھی۔ پیشہ ور بل فائنگ کا خطاب ہمیشہ میڈرڈ کے بل فائنگ میں دیا جاتا ہے۔ بل فائنگ میں دو طرز ہیں۔ ایک اندلس کی اور دوسری میڈرڈ سے متعلق ہے۔ میڈرڈ کی روایات کے پابند بل فائنگ کار جہاں شرمیلی کی جانب ہوتا ہے اور وہ بل کے گزرنے کے بعد ایک بت کی مانند ساکت ہو جاتا ہے۔ بل فائنگ اندلس کا ہر تو وہ صاحب طرز اور پھر تیار ہوگا۔

ارنلٹ مینگوے اپنی کتاب (

لکھتا ہے: "اندلس کے صوبے کو ہمیشہ سے یہ فخر حاصل ہے کہ غلیظ بل فائنگوں کی اکثریت اسی خطہ زمین سے متعلق رکھتی ہے۔ یہاں کے بل بھی ہسپانیہ بھر میں بہترین مانے جاتے ہیں۔ یہ گرم آب و ہوا اور مسلمانوں کے خون کی آمیزش کا اثر ہے کہ اندلسی بل فائنگ پُر وقار اور پُر سکون ہوتے ہیں۔ یہ خصوصیات ہسپانیہ کے دوسرے صوبوں سے تعلق رکھنے والے بل فائنگوں میں ناپید ہیں۔"

عام تخیل کے برعکس ایک اچھے بل فائنگ کے لیے طاقتور ہونا بالکل ضروری نہیں۔ اچھا بل فائنگ کھیلک اور سامنے کی آمیزش کو بڑے کاردار بل کو اپنے بس میں کر لیتا ہے۔ ایک دفعہ خانہ بدوش بل فائنگ راخیل ال گارو سے کسی نے پوچھا کہ وہ اپنی طاقت بڑھانے کی خاطر کونسی ورزش کرتا ہے تو اس نے جواب دیا: "مجھے طاقت کی کیا ضرورت ہے؟" عام بل کا وزن تقریباً آدھ ٹن ہوتا ہے۔ کیا میں ورزش کے ذریعے اس کی طاقت کی بھری کر سکتا ہوں؟ بل کو اپنی طاقت بڑھانے دو۔ ایک بل فائنگ میں پھر بل ہلاک کئے جاتے ہیں اور ہر بل فائنگ کے حصے میں دو بل

آتے ہیں۔ اگرچہ آٹھ ماہ کے بچے فائنگ کے سیزن میں (سر دیوں میں بچے فائنگ نہیں ہوتی) ایک بچہ فائٹر سو سے زیادہ بچے ہلاک کرتا ہے مگر یہ کبھی نہیں ہوگا کہ بچے فائٹر ہمیشہ ہی اس کھیل کے اختتام پر فاتح بن کر ابھرے کبھی کبھار کسی گرم دوپٹے کے ذریعے سینگت چشم زہل میں سنہری ریشمی لباس پہنا کر سرخ خون میں نشتر جاتے ہیں۔ سرخ انسانی خون میں.....

ہسپانیہ کا عظیم بچہ فائٹر سوزنا لینے ایک ایسی ہی دوپٹہ کر جب بتا دے کہ غیر معروف بچہ رنگ میں ہلاک ہو تو پوسے ہسپانیہ میں سرکاری طور پر سوگ منایا گیا۔ اسی لیے تو بچوں کاٹ کو پڑو قرار ہونے کے ساتھ ساتھ خطرناک اور افسوسناک بھی قرار دیا جاتا ہے۔

عظیم بچہ فائٹروں کی اکثریت بچے کی بجائے ٹی بی اور سفلس جیسے امراض کا شکار ہوتی ہے۔ بچہ فائٹر جب بچہ رنگ میں قدم رکھتا ہے تو سورج اپنی پوری آفتاب سے چمک رہا ہوتا ہے بجاری اور رنگ لباس کے اندر ہوا کا گڑبگڑ نہیں ہوتا اور اس کے جسم سے پسینے کے ذائقے چھوٹنے لگتے ہیں۔ پھر آہستہ آہستہ سورج غروب ہونے لگتا ہے۔ یہاں تک کہ بچہ فائٹر کے انتقام پر خاصی خنکی ہو جاتی ہے۔ گرمی اور سردی کی شدت اس کے پیپیرڈوں پر اثر انداز ہوتی ہے بچہ رنگ کی حوصلہ بھی ہلکے ثابت ہوتی ہے اور بچہ فائٹر ٹی بی کا شکار ہو جاتا ہے۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ موسمی عناصر کے تغیر پر تو اس کا اختیار نہیں مگر سفلس.....؟ اس کا جواز کچھ یوں دیا جاتا ہے کہ بچہ فائٹر بھی ایک فنکار کی مانند اگر شادی کر لے تو اس کی صلاحیتیں منسوخ ہو کر رہ جاتی ہیں۔ چونکہ اس کے پاس اشناقت نہیں ہونا کہ وہ عورتوں سے میل جول بڑھانے سے قبل انہیں اچھی طرح پرکھ سکے۔ اس لیے کبھی نہ کبھی کوئی ”چنچل لڑکی“ اسے یہ خوفناک تحفہ دے جاتی ہے بچہ فائٹر اپنی جان نہ صرف بچہ رنگ میں بلکہ بستر میں بھی دائرہ پر لگتا ہے۔

چونکہ بچہ فائٹر صرف اس وقت شروع کی جاتی ہے جب بچہ رنگ کا نصف حصہ دھوپ میں اور بقیہ نصف چھاؤں میں آجائے۔ اس لیے بچہ فائٹر کے اوقات

بہتے دھبے ہیں۔ اس عظیم قماشے کی تکنیک اور کامیابی کا راز سورج کے چمکنے میں پنہاں ہے۔ جب تک سورج بچہ رنگ کے نصف حصے پر نہ چمکے بچہ فائنگ کا نصف نہیں آتا ایک ہسپانوی مقولے کے مطابق ”سورج سب سے عظیم بچہ فائٹر ہے“ دھوپ کے بغیر بچہ فائٹر اپنے آپ کو ناممکن سمجھتا ہے یوں جیسے وہ سائے کے بغیر پیدا ہو گیا ہو۔

بچہ فائٹر اور سورج کے بعد بچہ فائنگ کی شیج کا سب سے اہم کردار بچہ ہوتا ہے۔ ہسپانیہ کے طول و عرض میں متعدد ایسے فارم ہیں جہاں بچہ فائنگ میں حصہ لینے والے اعلیٰ نسل کے بچے پالے جاتے ہیں۔ ہر فارم کا بچہ خصوصی عادات و اطوار کا مالک ہوتا ہے۔ تجربہ کار قماشانی بچے کے بچہ رنگ میں داخل ہوتے ہی بتا دیتے ہیں کہ یہ فلاں فارم کا پروروہ بچہ ہے۔ پڑش کے دوران میں سولے رکھ لے کے اور کوئی شخص بچے کے پاس نہیں پیش کر سکتا تا کہ وہ انسان کے ساتھ میل جول سے اپنے خوفناک جنگی اطوار نہ کھوے۔ یہی وجہ ہے کہ بچہ رنگ میں داخل ہوتے ہی قماشوں کا شور و غوغا بچے کو پریشان کر دیتا ہے۔ دریائے وادی الکبیر کی وادیوں میں پڑش پانے والے بچے بہترین جاتے ہیں۔ ۱۸۵۰ء میں کوئچا فارم کے پروروہ بچے نے اپنے سینگ سے ڈومینگو نامی بچہ فائٹر کی ایک اٹھ نکال دی۔ اس حادثے کے بعد ڈومینگو کو کاٹا بچہ فائٹر کہا جانے لگا۔ اور اس نے قسم کھالی کہ اب وہ ساری زندگی صرف کوئچا فارم میں پلے ہوئے بچے ہی لڑے گا۔

بہترین بچہ فائنگ کے لیے بچے کا وحشی اور نا تجربہ کار ہونا از مد ضروری ہے۔ اسی لیے جو بچے ایک مرتبہ بچہ رنگ میں داخل ہو جائے اسے ہمیشہ ہلاک کر دیا جاتا ہے۔ اگر کسی وجہ سے اسے بچہ رنگ میں نہ مارا جاسکے تو پھر بچہ فائٹر ختم ہونے پر اسے فارم میں لے جا کر ہلاک کر دیا جاتا ہے۔ اگر بچہ نہ مارا جائے اور ایک سے زائد مرتبہ اسے بچہ رنگ میں داخل ہونے کا موقع دیا جائے تو پھر بچے کی بنا پر بچہ فائٹر کو یقیناً ہلاک کر دیتا ہے۔ شروع شروع میں جب یہ پابندی مائدہ تھی تو ہر سال بچے

رنگ میں سینکڑوں بل نائٹس اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھتے تھے چنانچہ ۱۵۶۷ء میں پوپ نے اُن تمام عیسائی شہزادوں کو مذہب سے باہر نکال دینے کی دھمکی دے دی جن کی ریاستوں میں بل نائٹس رائج تھی۔ بالآخر سب نے متفقہ طور پر ایک ایسا قانون لاگو کرنے کا فیصلہ کیا جس کے تحت ایک بل صرف ایک مرتبہ ہی بل نائٹس میں حصہ لے سکتا تھا۔

اب بھی ہسپانیہ کے دور افتادہ قصبوں میں اس قانون کا احترام نہیں کیا جاتا۔ نصیبے کے باشندے اتنے غریب ہوتے ہیں کہ وہ ہر بل نائٹ کے لیے نیابل خریدنے کی ہمت نہیں رکھتے۔ چنانچہ عزائم اور تجربہ کار بل نائٹس کو ہلاک کر دیتا ہے۔ ایک ایسے ہی بل کے بارے میں مشہور ہے کہ اس نے ایک سیزن میں سو بل نائٹس کو ہلاک کر ڈالا اس کا سوا سال شکار ایک چودہ سالہ خاندان بدوش لڑکا تھا جس کا ایک بھائی اور بہن اس ماوشے کے وقت بل رنگ میں موجود تھے۔ ان دونوں نے اس قاتل بل سے اپنے بھائی کا بدلہ لینے کا فیصلہ کیا اور اُس کے بعد بل جہاں بھی جاتا وہ اس کا پیچھا کرتے تاکہ موقع پا کر اس کا کام تمام کر دیں۔ اوہر بل کا مالک اپنے قیمتی جانور کی بے حد حفاظت کرتا تھا اس لیے وہ اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہو سکے۔ یونہی کئی برس بیت گئے اور خانہ بدوش لڑکا اور لڑکی انتقام کی آگ سینے میں سلگائے بل کا تعاقب کرتے رہے۔ بالآخر ایک وقت ایسا آیا کہ بل بوڑھا ہو گیا اور اُس کے مالک نے اسے ناکارہ بان کر ولسیا کے بوچ خانے میں فروخت کر دیا۔ خانہ بدوش جوڑے نے بوچ خانے کے مالک کو چنے پایسے بھائی کے ہلاک ہونے کی داستان سنا دی اور اس سے درخواست کی کہ انہیں بل کو مارنے کی اجازت دی جائے۔ مالک کو تو صرف بل کے گشت سے مزین تھی چنانچہ اس نے اجازت دے دی۔ ادویوں لڑکے نے پہلے اپنی انجیلوں سے بل کی دونوں آنکھیں نوج ڈالیں اور پھر خون آلود گڑھوں میں غرق کیا۔ اس کے بعد اس نے ریڑھ کی ہڈی خنجر سے کاٹ دی۔

سب سے آخر میں دونوں بہن بھائیوں نے بل کا کیچہ نکالا اور بوچ خانے سے باہر گرڈ آلودگی میں بیٹھ کر اُسے ایک سیخ پر بھون کر کھا گئے۔ اس لڑکے انتقام کے بعد وہ چپ چاپ اپنے وطن کو لوٹ گئے۔

لیٹ کیپر کو جب اپنا ٹکٹ دکھا کر بل رنگ کے اندر داخل ہوا تھا تو مجھے یوں محسوس ہوا جیسے شرخ رنگوں کا ایک متحرک سیلاب ہے جو میری آنکھوں میں کھینچا پلا آتا ہے۔ پورا بل رنگ ایک بڑے ملتان پیالے کی مانند تھا جس کے اندر وہی جھٹے ہیں ہر رنگ کے چھینٹے تھے بل رنگ کے آداب سے ناواقفیت کی بنا پر کڑی کی سخت نشست پر دکھنے کے لیے گدانا بھول گیا تھا۔ یہ گدے کراٹے پر مل جاتے ہیں۔ قماشوں کی اکثریت ہسپانوی تھی مگر مختلف گروہوں میں غیر ملکی سیاح بھی تھے یکسرے اور بل نائٹ کے کتا بچے ہاتھوں میں لیے وہ اپنے گاندھ حضرات کا منہ تک رہے تھے جو انہیں ہونے والی بل نائٹ کی تفصیلات بتا رہے تھے۔

بل کے میدان کے اندر داخل ہونے پر بل نائٹ شروع نہیں ہوتی بلکہ اس کا آغاز اس سے بہت پہلے ایک رسمی کارروائی کے ذریعے ہوتا ہے جس کی تفصیل کچھ یوں ہے۔

بل نائٹ شاید ہسپانیہ کی وہ واحد تقریب ہے جس کا آغاز وقت مقررہ پر ہوتا ہے۔ عین وقت پر پورا ہجوم بالکل خاموش ہو گیا اور سب کی نگاہیں سایہ دار حصے میں واقع صدر کی کیسین پر لگ گئیں۔ صدر نے جو اس تقریب کا مختار بل ہوتا ہے اپنا معطر رمال نصائیں لہرا کر بل نائٹ کے شروع ہونے کا اعلان کیا اور اس کے ساتھ ہی بل رنگ میں جگل کی آواز گونجی اور شاہان لباس میں ملبوس دو گھڑ سوار اپنے گھوڑے سرپٹ دوڑاتے صدر کی کیسین کے عین نیچے آن رُکے۔ یہ گھڑ سوار ال گوسلز کہلاتے ہیں۔ صدر کے تمام احکامات بل نائٹ تک ہسپانائوں کے ذمے ہوتا ہے۔ گھڑ سوار جبکہ صدر سے پرید کے آغاز کی اجازت ملنے پر اپنے گھوڑے سرپٹ دوڑاتے

ہوتا ہے! گردن کس زاویے پر جھکا تا ہے! تھوڑی سی چھڑ چھاڑ کے بعد معاذین واپس چلے گئے۔ اب بُل فائٹر گیری سے نکل کر میدان میں داخل ہوا، اور پورا بُل رنگ تماشا تیروں کی تالیوں سے گونج اٹھا۔ بُل فائٹر نے اپنی کیپ دونوں ہاتھوں میں کچھ یوں تمام رکھی تھی جیسے اُسے دھوپ میں سکھار رہا ہو۔ وہ بُل سے تقریباً پانچ گز کے فاصلے پر جا کھڑا ہوا اور کیپ جھٹک کر اُسے حملہ آور ہونے کی تربیب دی بُل اپنی تھوڑی سی اٹھائے خاموش کھڑا رہا۔ بُل فائٹر نے تھوڑے قریب ہو کر پھر کیپ جھٹکی مگر بُل ٹس سے مس نہ ہوا۔

”میں نہ کتنا تھا کہ یہ بُل بزدل ہے۔“ میرے قریب بیٹھے موٹے ہسپانوی نے اپنے ساتھی کو چھیڑا۔

”بس دیکھتے جاؤ۔ ابھی تو ابتدا ہے۔ بُل یقیناً بہادر ہے اور ابھی حالات کا جائزہ لے رہا ہے۔“ اُس کے ساتھی نے سنجیدگی سے کہا۔

بُل فائٹر اب کیپ جھٹکنے کے ساتھ ساتھ بُل سے باتیں بھی کرنے لگا۔ ہو ہو۔۔۔ یو یو ہے۔۔۔۔۔ ہے تو رو! بُل نے بالآخر سر اٹھا کر بُل فائٹر کو بڑی ناراضگی سے دیکھا جیسے کہہ رہا ہو کہ یہ کیسیا سے تو رو اور ہے ہے کی لایعنی گردان کر رہے ہو! جاؤ اپنا راستہ پالو کیوں ہم فقیروں کو ڈسٹرب کرتے ہو! اُدھر بُل فائٹر نے اس فقیر کو ڈسٹرب کرنے کی قسم کھا رکھی تھی اور اُدھر تماشا تیروں نے تحریک عدم تعاون کا بے حد بُرا منایا اور تو رو! تو رو! کا شور مچانے لگے۔ موٹے ہسپانوی نے جو بُل کو بزدل قرار دے چکا تھا۔ منہ میں انگلیاں گھسیڑ کر اس زور سے میٹھی سبجائی کہ میرے کانوں کے پردے لرز اٹھے۔ بُل پر بھی اس شور و غوغا کا خاصا اثر ہوا۔ اس نے سامنے کھڑے اپنے دشمن کو بڑے غور سے دیکھا۔ پچھلے ٹمپوں سے ریت اڑائی اور تھوڑی سی نیچے کر کے بُل فائٹر پر حملہ آور ہو گیا۔ بُل کی تھوڑی سی اور سینگ کیپ کو چھوتے ہی بُل فائٹر نے پنجوں پر گھوم کر کیپ ہوا میں لہرا دی اور بُل سر نیچا کئے اپنے زوریں

تپتی دوپہر میں موت

اپنا ٹک بُل کی تیز آواز رنگ میں گونج گئی۔ بوڑھے نے دائیں ہاتھ سے اپنا بوسیدہ ہیٹ اُتار کر اٹھنے کا پسینہ پونچھا اور پھر بائیں ہاتھ سے اسٹیل کا سرخ دروازہ زور لگا کر دھکیلا اور بڑی پھرتی سے پیچھے ہٹ گیا۔ چشم زدن میں ایک بھاری بھر کم سیاہ بُل۔۔۔۔۔ بُل رنگ میں کان پڑی آواز سنائی دے رہی تھی ”بے تورو ہے تورو“ تماشا تیرے اپنے زور مال۔ ہیٹ اور نیچے ہلا کر اُسے اپنی جانب متوجہ کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔۔۔۔۔ بُل فائٹر کے پیٹے ڈرامے کا کردار نم ٹھونکے میدان میں کھڑا تھا۔ اُدھر بُل فائٹر شروع ہو چکی تھی۔

میرے قریب بیٹھے ہوئے موٹے ہسپانوی میدان میں کھڑے بُل کے بارے میں بحث کر رہے تھے۔ اگلی نشستوں میں براجمان سیاح لڑکیوں کا ایک گروہ زور زور سے تالیاں پیٹ رہا تھا۔

باتاوندہ بُل فائٹر کا آغاز بُل فائٹر کی بجائے اس کے معاذین نے کیا۔ انھوں نے بُل کے آگے کیپ لہرا کر اُسے چھیڑا اور پھر بُل کے مشتعل ہونے پر اُس کے آگے پیچھے بھاگنے لگے۔ اُن کا مقصد بُل کو اُدھر اُدھر بھاگ کر اُس کی تیزی ختم کرنا تھا! اس دوران میں بُل فائٹر کڑی کی گیری کی آڑ لیے بُل کی عادات و اطوار کو جانچ رہا تھا۔ کونسا سینگ زیادہ استعمال کرتا ہے! کونسی آنکھ تیز ہے! کس جانب سے حملہ آؤ

بھاگتا ہوا آگے نکل گیا۔

بل فائنگ کا یہ انداز دیرینہ کا تھا۔ بل کا پہلا وار خالی گیا تو وہ مڑ کر پھر چلا اور ہوا۔ اب بھی اس کے تیز سینک بل فائٹر کے جسم کی بجائے صرف کیپ کو چھوئے گا وہ ناکام ہو گیا۔

بیکریل بیٹی "موتے سپانزی نے اپنے ساتھی کو شوکا دیا۔ بل مہادے کہ نہیں؟" اب بل بار بار بل فائٹر کی طرف پکتا مگر وہ دیرینہ انداز سے اپنے آپ کو منہ بچا جاتا۔ جب بل سر نہ بچا کر بل فائٹر کی جانب دوڑنا شروع کرتا تو ماشائی ایک ساتھ او..... اور..... اور کا نعرہ لگاتے اور جوہنی بل کے سینک کیپ کو چھوتے اور بل فائٹر پنجوں پر گھوم کر اپنے آپ کو بچا جاتا۔ اس نعرے کا انتقام "لے" پر ہوتا "اولے" سپانزیوں کا مہربان کہنے کا خاص انداز ہے جس کے بارے میں شفیق الرحمن کو شبہ ہے کہ یہ والد کی بڑی ہوئی شکل ہے۔ ماشائیوں سے بے پناہ داد ملنے پر بل فائٹر قدرے نڈر ہو گیا اور آگے بڑھ بڑھ کر بل کو "ہو ہو" کرنے لگا۔ بل فائٹر بل کے جتنے قریب ہو کر لڑے گا اتنا ہی یہ اس کے حق میں خطرناک ثابت ہو گا۔ سینکوں سے زخمی ہونے کا خطرہ بھی آدمی خود غفلت کرتا ہے اگر وہ بل فائنگ کے ناعدوں کی خلاف ورزی نہ کرے تو سینک اس کے جسم سے ایک دو باج کے فاصلے سے گزر جائیں گے اور وہ محفوظ رہے گا۔ کوئی بھی بل فائٹر تہی زخمی ہوتا ہے جب وہ وقت کا تعین نہ کر سکے اور گھومنے میں دیر کرے اور باپ پھر انتہائی ناخوش ہو گا۔

بل فائٹر کو اپنے قریب دیکھ کر بل کی ہمت بندھی اور اس نے پھر دعا والوں دیا۔ لیکن اس مرتبہ بھی بل فائٹر نے کیپ اس انداز سے گھائی کہ بل کیپ سے چھو کر اپنے زور میں میدان کے درمیان تک چلا گیا۔ پورا رنگتالیوں سے گونج اٹھا۔ ایک دم میری آنکھیں چند صیا گئیں۔ بل رنگ کی ہر شے سفید ہو گئی۔ بل فائٹر

سفیدی میں ڈوبا ہوا بل سفید۔ جیسے ایک اور ایکسپوزڈ تصویر کا نیگیٹو ہو اور پھر بہت آہستہ تمام چیزیں اپنی اصلی رنگت پر لوٹنے لگیں..... کچھ بھی نہ تھا۔ میں نے آنکھیں میس تو ایک اور فلیش ہوا..... یا وحشت یہ کیا ہو رہا ہے۔ ادھر بل فائٹر اپنے کمال دکھا رہا تھا اور ادھر میری آنکھیں اس تیز روشنی سے چند صیا رہی تھیں۔ میں نے جھنجھلا کر ایک مرتبہ پھر اپنی آنکھیں میس اور اپنے عین سامنے دیکھا۔ اگلی نشستوں پر بیٹھے ہوئے تمام ماشائی بل فائٹر دیکھنے میں محو تھے۔

اب کی بار بل فائٹر نے بل کو اپنی جانب متوجہ کیا اور جوہنی بل حلا اور ہوا، اس نے کیپ فضا میں لہرانے کی بجائے ایک دم سیٹ لی۔ بل جو کیپ کے پیچھے پیچھے بھاگا چلا اور ہوا تھا کیپ کے سٹ جانے سے ایک دم رکا۔ اس کی اگلی دو ٹانگیں لڑکھڑائییں اور وہ گرتے گرتے بچا۔ یہ دیرینہ انداز کی قسم دی بولیرا یعنی جس میں ایک خاص طریقے سے کیپ ایسٹن کے وجہ سے بل اگلی ٹانگوں پر گر جاتا ہے۔ ماشائیوں نے پھر دل کھول کر داد دی۔ بل فائٹر ایک مرتبہ پھر بل کے سامنے سینہ تان کر کھڑا ہو گیا اور اسی لمحے مجھ سے تین چار قطاریں آگے بیٹی ہوئی ایک سرے بالوں والی لڑکی نے بل رنگ سے مزہ موڑا اور ایک دم نشست سے اٹھ کر اپنے کمرے کا رخ میری جانب کر کے ٹن دبا دیا..... ایک فلیش ہوا..... اور میری آنکھوں کے سامنے ہر شے سفید ہو گئی۔ میں نے سر جھٹک کر فلیش کے خیر و کئی اثرات کو زائل کیا۔ وہ لڑکی اپنی نشست پر بیٹھی بڑے اطمینان سے بل فائٹر دیکھ رہی تھی..... میں تھکا کر رہ گیا۔ آخر کر بھی کیا سکتا تھا۔!

بل فائٹر کے ڈرامے کا پہلا ایکٹ ختم ہو چکا تھا۔ بل فائٹر ماشائیوں کے نعرے لہنے تمہیں کے جواب میں مڑ کر تک جھکا ان کا شکریہ ادا کر رہا تھا۔ اس سے چند قدم کے فاصلے پر بل بڑی شان بے نیازی سے کھڑا پبلک کو گھور رہا تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ بل رنگ کی بجائے اپنی چراگاہ میں کھڑا ہو جہاں یہ ڈھیر سارے لوگ

اُسے خواہ مخواہ ستانے آگئے ہیں۔ ایک مرتبہ پھر صدر کی کعبین سے گھنٹی بجی اور بل فاشٹ کا دوسرا حصہ شروع ہوا۔ بل فاشٹ کڑی کی گیلری کے پیچھے جا چکا تھا اور میدان میں سوائے بل کے اور کوئی نہ تھا۔ اب میدان میں ایک تپک دور گھڑ سوار داخل ہوا۔ آنکھوں کا نوز اور ٹانگوں کے سرگھوٹے کا مقام جسم روتی کے گدلیوں سے ڈھکا ہوا تھا۔ گھڑ سوار کے ہاتھ میں ایک "پک" یعنی نیزہ تھا جس کی انی دھوپ میں چمک رہی تھی۔ "پک" آدور یعنی نیزہ بردار۔ بل فاشٹ کے اس حصے پر سب سے زیادہ کمتہ چینی ہوتی ہے کیونکہ اس کے دوران میں بے چارے گھوڑوں کی بے پناہ شامت آتی ہے۔ پکا دور کا سست رو گھوڑا جسے شاید اپنے اسنام کا علم تھا بے حد آہستہ چل رہا تھا اور بل کے قریب جانے سے کترار ہا تھا۔ چوتھی قطار میں بیٹھی محترمہ نے بل رنگ سے منہ موڑا اور کیمرو لے کر کھڑی ہو گئیں۔ لیکن اس سے پہلے کہ وہ ٹین دباتیں، میں نے شور مچایا۔ "یہ کیا ہو رہا ہے؟ میری تصاویر کس خوشی میں بنائی جا رہی ہیں؟ وہ کجنت بھیسا تو دوسری جانب اپنے جوہر دکھا رہا ہے۔"

سُسنرے بالوں والی محترمہ نے کیمرو آکھ سے ہٹایا اور نہایت بدقیبزی سے بولیں۔ "میں اس لیے منجاری تصاویر کیج رہی ہوں کہ میرے خیال میں تم بھیسنے سے زیادہ خوش شکل ہو۔"

میرے گرد بیٹھی ہوئی پیک اس جواب پر بہت مغلوظ ہوئی اور آوے، اوے کے نعرے بلند ہونے لگے، بلکہ ایک دوسرے مجھے "سے تو" کہہ کر بھی بلایا۔ میں کھسیانا ہو کر اپنی نشست میں دُبک گیا۔..... اُدھر فلیش ہو اور ہمارے تصویر پھر اُتر گئی۔ میں دل ہی دل میں پیچ و تاب کھا رہا تھا۔ میرا خیال ہے ایسے حالات میں ہر اس شریف آدمی کو پیچ و تاب کھانے کا حق ہے جس کی خوبصورتی کا پیمانہ ایک عکس کالے کھونٹے آدھ دن وزنی بھیسنے کو ٹھہرایا جائے۔

پکا دور کا گھوڑا شاید اڑیل قسم کا تھا اُس نے بل کے پاس جانے سے بالکل انکار کر دیا۔ اس پر پکا دور نے پھر وہی سب سے تو "سے تو" کی گردان کی۔ بل گردن اٹھا کر گھوڑے کو غور سے دیکھنے لگا۔ اس کے سامنے ایک ایسا عجیب الخفقت جانور کھڑا تھا جو اتنی گرمی کے باوجود بل رنگ میں رسانی اور زہر کر آگیا تھا۔ بل نے آؤ دیکھا "تاؤ، سرپٹ دوڑتا ہوا آیا اور گھوڑے کے پیٹ میں ایک زوردار ٹکڑا رسید کی۔ اُس کے نوکیلے سینک شاید گدیے کی روتی میں سے گزر کر گھوڑے کی پسلیوں میں پروست ہو چکے تھے۔ ٹکڑے گھوڑا لڑکھڑایا، مگر اسی لمحے پکا دور نے اپنے نیزے کی انی بل کی گردن میں بھونک دی۔ بل گھوڑے کی پسلیوں میں سینک گھسیٹنے بتنا زور لگا تا نیزے کی انی اس کی گردن میں اتنی ہی زیادہ کھیتی چلی جاتی۔ یہاں تک کہ اس کی گردن سے خون بہنے لگا اور تکلیف کی شدت سے بے بس ہو کر تھپے ہٹ گیا۔ بل کی گردن میں زخم کرنے کا مقصد اس کی طاقت کو زائل کرنا ہوتا ہے، تاکہ اس کی تیزی سست روی میں بدل جائے اور بعد میں بل فاشٹ اُس کے ساتھ اچھی طرح کھیل سکے۔ اس ایکٹ میں بل کی بہادری کا امتحان ہوتا ہے۔ اگر وہ ایک مرتبہ زخم کھا کر دوبارہ حملہ آور نہ ہو تو اُسے بزدل سمجھا جاتا ہے۔ مگر یہ بل اپنے گھرے زخم سے رستے ہوئے خون کی پردا کئے بغیر نشانہ تاک کر پھر گھوڑے پر حملہ آور ہو گیا۔ اُدھر بل کے سینک گھوڑے کے پیٹ میں گھسے اُدھر پکا دور نے اپنا خون آلود نیزہ اس کے زخم میں گھونپ دیا۔ بل بتنا آگے بڑھ کر گھوڑے کے پیٹ میں ٹکریں مارتا نیزے کی انی اتنی ہی گہرائی میں چھتی چلی جا رہی تھی۔

میرے قریب بیٹھا موٹا ہسپانوی بل کی اس بہادری پر نہال ہو رہا تھا اور بار بار اپنے ساتھی کو لعن ملن کر رہا تھا جس نے بل فاشٹ کے آغاز میں اس بل کو بزدل کہنے کی جسارت کی تھی۔ یہ بہادر بل اپنی گردن میں دھنسی ہوئی نیزے کی انی کی پردا کئے بغیر برابر گھوڑے کے پیٹ میں سینک گھسیٹے اُسے گرانے کی

گوشش میں مصروف تھا۔ گھوڑا یوں کھڑا تھا جیسے اُسے سانپ سونگھ گیا ہو۔ اس وقت وہ سفید گدیلوں میں لپٹا گھوڑے سے زیادہ ایک بے ہنگم قسم کا پرندہ لگ رہا تھا۔ بل کی قوی گردن، نوکیلے سینک اور چوڑے کانڈھے اس کے پیٹ میں گھسنے گئے۔ یہاں تک کہ اس کی دو ٹانگیں ہوا میں لٹک گئیں۔ ستم معتن ہو گئے۔ گردن جھک گئی اور بالآخر وہ لٹک کھڑا کر زمین پر گر پڑا۔ گھوڑے کے زمین پر گرتے ہی پکا دور بھاگ کھڑا ہوا۔ گھوڑا امر چکا تھا۔ زخمی بل کی گردن سے خون رس رس کر اکھاڑے کی ریت پر گر رہا تھا۔ وہ سر بلند کئے اکھاڑے کے گرد بھاگنے لگا۔ جیسے اپنی بہادری کی داد طلب کر رہا ہو۔ تمام لوگ اپنی نشستوں سے اٹھ کھڑے ہوئے اور تالیاں بجا کر بل کی بہادری کا اعتراف کیا۔ اس دوران میں ایک اور پکا دور گھوڑے پر سوار میدان میں داخل ہوا۔ نو دارو نے جب اپنے بھائی کی خون آلود لاش میدان میں پڑی دیکھی تو ہنسنایا اور واپس جانے کے لیے مڑا۔ لوگوں نے شور مچا دیا۔ شور سے بل گھوڑے کی جانب متوجہ ہو گیا۔ ایک اور شکار..... وہ اپنی پوری قوت سے حملہ آور ہوا اور پہلی ہی ٹکڑے سے گھوڑے کو گرا دیا۔ قاتالیوں نے آسمان سر پر اٹھالیا۔

”سان ساستیان کے بل رنگ میں اس سے بہادر بل کبھی نہیں دیکھا گیا۔“
 موٹے ہسپانوی کی آنکھوں سے آنسو رواں تھے اور وہ بے حد جذباتی ہو رہا تھا۔
 اب میدان میں تیسرا پکا دور داخل ہوا۔ بل حسب معمول نشانہ تاک کر چھ جگہ آدھ ہوا اگر اس مرتبہ قسمت نے یاوری نہ کی اور اس کے سینک گھوڑے کے پیٹ میں داخل ہونے سے پہلے ہی پکا دور کا نیزہ اس کے کولہن میں اتر گیا۔ اس نے زور لگا کر آگے بڑھنے کی کوشش کی مگر تازہ زخم میں اتنی کی تکلیف وہ موجودگی نے اُسے پیچھے ہٹنے پر مجبور کر دیا۔ کثیر مقدار میں خون بہنے کی وجہ سے بل کی طاقت میں کمی آ رہی تھی اور اب وہ خاصا سست رو ہو چکا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ بل فاسٹ میں گھوڑے

کا مرنا قدرتی بات ہے، بل فاسٹر کبھی کبھار مرتا ہے اور بل ہمیشہ مرتا ہے۔ گھوڑے کی موت کا سب سے زیادہ افوس عینر کی قاتالیوں کو ہوتا ہے جن کی اکثریت اس بے رحمی کی تاب نہ لاتے ہوئے بل رنگ سے داک آؤٹ کر جاتی ہے۔ تجربہ کار ہسپانوی ایسے موقعوں کی تاک میں رہتے ہیں اور فوراً ان کی منگی نشستوں پر قبضہ جھانپتے ہیں۔ چوتھی قطار میں بیٹھی عینر کی لڑکیاں بھی پکا دور کے عمل کے دوران انکھوں پر ہاتھ رکھ کر زار و قطار روتی رہیں۔

صدر کے اشارے پر ایک مرتبہ پھر بل رنگ میں بگل کی آواز گونج گئی۔ بل فاسٹ کا تیسرا ایکٹ شروع ہونے کو تھا۔ موسیقاروں کے طائفے نے بل فاسٹ کی مخصوص موسیقی کی دھن چھیڑ دی۔ بل فاسٹر وہ بارہ میدان میں داخل ہوا اگر اس مرتبہ اس کے ہاتھوں میں کیپ کی بجائے دو باندیلو تھیں۔ گھین کا غد میں لپٹی گز بھر لی اُس چھڑی کو کھتے ہیں جس کے سرے پر چھ اونچ لمبی ایک برہمی لگی ہوتی ہے۔ بل فاسٹر بل سے چند گز کے فاصلے پر بازو لٹکا کر کھڑا ہو گیا اور اُسے ششکارا۔ بل نے گردن اٹھا کر دیکھا۔ اس کے سامنے بلا ہر ایک نہتا آدمی کھڑا تھا اور تیزی سے اس کی جانب لپکا۔ بل فاسٹر کے قریب آکر اس نے اپنا سر جھکالیا تاکہ اُسے سینگوں پر اچھال دے۔ مین اسی وقت بل فاسٹر نے ہاتھ فضا میں بلند کیا اور دونوں باندیلو بیک وقت گردن کے زخم کے قریب گاڑ دیں۔ قاتالیوں نے ایک مرتبہ پھر تالیاں بجائیں کیونکہ باندیلو مناسب فاصلے پر لگائی گئی تھیں اور گردن پر سیدھی کھڑی ہونے کی بجائے جیسا کہ ہونا چاہیے تھا، گردن سے نیچے ٹٹک رہی تھیں۔ یہ عمل تین مرتبہ دہرایا گیا اور کل چھ باندیلو کی جسم میں پورست ہوئیں۔ اس حرکت کی خصوصیت یہ ہے کہ باندیلو ہاتھ اٹھا کر اس طرح لگائی جائیں کہ بل کے سینک بل فاسٹر کے جسم سے چھو کر نکل جائیں۔ باندیلو کو بل کی گردن کے زخم میں گاڑنا بچہ میرب گردانا جاتا ہے۔

اکھاڑے میں داخل ہوتے وقت بل کو اعتماد تھا کہ وہ ہر شے کو فنا کر کے رکھ دے گا۔ وہ بل فائٹر کے معاندین، لکڑی کی گیلری اور گھمڑوں پر خوشیہ انداز میں حملے کر رہا تھا مگر اب نیزے کے ایک زخم کے علاوہ اس کے جسم میں پیوست چھ برچھیوں نے اسے ایک تکلیف دہ احساس سے روشناس کروا دیا تھا۔ وہ ناقابل تسخیر نہیں ہے۔ اس کا گھنڈہ ناک میں مل چکا تھا۔ اب وہ مد سے خوف زدہ تھا۔ انسان سے ہر سال..... انسان جس نے کیل ہی کیل میں اسے بُری طرح گھائل کر دیا تھا۔ اب وہ اپنا بچاؤ کرنا چاہتا تھا۔ وہ اس فضول کیل سے تنگ آچکا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ کیلنے کے بجائے کسی نہ کسی طرح اپنے دشمن کو ہلاک کر ڈالے۔

بل فائٹر کا مختصر درج بل کی موت ہے۔ شروع سے لے کر اب تک تمام داؤ بیچ اسی ڈرامائی انجام کی خوبصورتی کو مد نظر رکھ کر کھیلے گئے تھے۔ اس اختتامیہ کو "تربسیر" یعنی موت کا کھیل کہا جاتا ہے۔ ہمیشہ کی طرح بل اکھاڑے میں اکیلا کھڑا ہے۔ بگل بجاتا ہے۔ بل فائٹر میدان میں داخل ہوا۔ اس کے ہاتھ میں اب "مولیتا" ہے۔ مولیتا سرخ سرخ کے اس کپڑے کو کہتے ہیں جو ایک پھڑکی کے گرد لپٹا ہوتا ہے۔ یہ مولیتا بل کی بقیہ طاقت کو ختم کرنے اور اسے قتل کرتے وقت اس کا سر نیچا رکھنے کے کام آتا ہے۔ بل فائٹر اکھاڑے کے درمیان چلتا ہوا صدر کی کیبن کے نیچے پہنچا اور صدر سے بل کو قتل کرنے کی اجازت چاہی۔ صدر نے دو مال اٹھا کر اجازت دے دی۔

بل فائٹر پیچھے مڑا اور اپنا غالی ہاتھ فضا میں بلند کر کے اعلان کیا کہ وہ اس بل کو اپنی محبوبہ یا کسی عزیز دوست کی بجائے بل رنگ میں موجود ہزاروں تماشاؤں کے نام کرتا ہے۔ بل فائٹر کی اس جمہوریت پسندی کو سیٹیوں کی بوچھاڑ اور "براؤ" کے نعروں سے نوازا گیا۔ دھوپ کی شدت میں لب کی واقع ہو چکی غلی اور بل رنگ کا نصف سے زیادہ جتہ چھاؤں میں جا چکا تھا۔ موت کے سائے روشنی کے تعاقب

میں تھے۔ بل فائٹر نے جھک کر تماشاؤں کا شکریہ ادا کیا اور پھر سیدھا کھڑا ہو گیا۔ اس نے اپنی سنہری ٹوپی اتار کر زمین پر سے ماری اور دائیں ہاتھ میں مولیتا اور تلواریں پڑے بل کی جانب بڑھا۔ "ہو ہو" اس نے پکارا۔ بل نے بشکل سراسیمہ اور پھر تھکاوٹ اور زخموں سے چور ہونے کے باوجود دھوکے کی غرض سے آگے بڑھا۔ بل فائٹر نہایت نفاست سے بچوں پر گھوما اور بل مولیتا سے چھوٹا ہوا آگے نکل گیا۔

"اتانے تو رو سابلے لاطین" ایک نوجوان نے بل کی فراست اور بہادری کا اعتراف کرتے ہوئے نعرہ لگایا۔ یعنی بل لاطینی زبان خوب سمجھتا ہے۔

بل فائٹر نے متعدد بار بل کو حملہ آور ہونے کی دعوت دی اور پھر بڑی خوبصورتی سے اپنا بچاؤ کیا۔ ان حرکات کا مقصد بل پر اس مد تک غلبہ پالینا ہے کہ وہ تنگ کر ایک ایسی جگہ کھڑا ہو جائے جہاں اسے آسانی سے قتل کیا جاسکے۔ پوری بل فائٹر میں یہ حرکات سب سے زیادہ خطرناک اور خوبصورت ہوتی ہیں اور یوں تیزی سے گزر جاتی ہیں جیسے صحن کا ایک خیرہ کن شرارہ چمک کر بل بھریں آنکھوں سے اوجھل ہو جائے۔

تھوڑی دیر کے بعد بل اپنے لگا۔ اس وقت وہ بے مدد بھاری بھر کم محسوس کر رہا تھا۔ اس کی ٹانگیں کانپ رہی تھیں۔ اس کا سر جھک رہا تھا۔ زخموں کی شدت سے اس کا گوبراؤر پیشاب خارج ہو کر اکھاڑے کی ریت پر پھیل رہا تھا۔ یہاں یہ فرض کر لینا کہ بل اب ختم ہو چکا ہے انتہائی بیوقوفی ہوگی۔ وہ اب بے مدد خطرناک ہے۔ وہ صرف اسی صورت میں حملہ آور ہوگا جب اسے اپنی کامیابی کا سو فیصد یقین ہو جائے گا۔ بل فائٹر مولیتا اپنے دائیں ہاتھ میں تھامے بل کے بالکل قریب آگیا۔ بل پیچھے ہٹنے لگا یہاں تک کہ اس سرخ دروانے کے پاس جا کر کھڑا ہو گیا، جس میں سے صرف پندرہ منٹ قبل اتنے غرور سے پھنکارتا ہوا نکلا تھا۔ ایسی حالت میں اکثر بل اکھاڑے کے کسی ایسے کونے میں جا کھڑے ہوتے ہیں جو ان کے نزدیک محفوظ ترین

اس نے اپنا ہاتھ شاہانہ طریقہ سے فضا میں لہرا کر اعلان کیا اور بل کو قتل کرنے کی نیت سے نیچے مڑا۔ بل سر جھکانے عجیب سی نظروں سے اُسے دیکھ رہا تھا۔ گالوں نے اپنا گنجا سر کھجایا اور اکھاڑے میں موجود اپنے چھوٹے بھائی ہوئے کو کہنے لگا "یار ہو سے مخاری بڑی مہربانی ہوگی اگر تم اس بل کو میری طرف سے مار دو۔ مجھے اس کا دیکھنا پسند نہیں ہے یہ کہہ کر اس نے اپنی تلوار اور مولیتا زمین پر پھینکا اور لکڑی کی گیلری پھلانگ کر بل رنگ سے جھاک گیا۔

مگر آج سان سبستیان کے اکھاڑے میں جو بل فائٹر (بعد میں معلوم ہوا کہ اس کا نام ہوئے موتس ہے اور ہسپانیہ کے بہترین بل فائٹروں میں شمار ہوتا ہے) سینہ تانے کھڑا تھا، وہ بل فائٹر کی آنکھوں میں بھری وحشت سے ذرہ برابر بھی خوف زدہ نہ ہوا۔ مولیتا اور سنگی تلوار بائیں ہاتھ میں مختصاً مے وہ بل سے تقریباً پانچ گز کے فاصلے پر کھڑا ہو گیا۔ بل کی نظریں مولیتے پر جمی تھیں اور وہ ثبت باکھڑا تھا۔ جب بل فائٹر کو یقین ہو گیا کہ بل اتنا تھک چکا ہے کہ اب اپنی جگہ سے حرکت نہیں کرے گا تو اس نے بل کی طرف سے منہ موڑا۔ ایک جھٹکے سے مولیتا میں سے تلوار کھینچی اور پھر دوبارہ مڑ کر بل کی جانب بڑھا۔ بے حد نپے تلے قدموں سے۔ آہستہ آہستہ۔ اُس کے سر تلوار کی نوک اور بائیں کا ندھے کا رخ بل کی طرف تھا۔ بل ایک خوفزدہ بچے کی طرح سہما کھڑا تھا۔ بل فائٹر نے اب اُس چھوٹی سی جگہ کا تعین کیا جو بل کے کندھوں کے درمیان اور سینگوں کے اوپر ہوتی ہے۔ عین اس مقام پر اگر تلوار گھونپی جائے تو وہ ریڑھ کی ہڈی میں سے گزر کر بل کا کام تمام کر دیتی ہے۔ گردن کا یہ حصہ بل فائٹر کو صرف اس وقت نظر آتا ہے جب بل حملہ آور ہو رہا ہو۔ گردن کے کسی اوڑھنے میں تلوار بھونکنا بزدلی اور ناتجربہ کاری پر محمول کیا جاتا ہے! چھ بل فائٹر مولیتا کے درست استعمال سے بل کو مجبور کر دیتا ہے کہ وہ گردن نیچی رکھے

ہوتا ہے۔ اسے بل کا گھر کہتے ہیں۔ اگر بل کو اس محفوظ جگہ کے اندر جا کر پھیرا جائے تو بل فائٹر کی ہلاکت یقینی ہوتی ہے چنانچہ بل فائٹر نے مولیتا بل کے آگے ریت پر بچھا دیا اور اُسے اپنی طرف کھینچنے لگا۔ بل نے مولیتا سونگھا اور آہستہ آہستہ اس کے نیچے چلتا اپنے گھر سے باہر نکل آیا۔

دھوپ ماند پڑ رہی تھی اور سان سبستیان کے سمندر سے آنے والی نم آلود ہوا میں خشکی نمایاں تھی۔ ریتوڑی دیر پہلے جو خواتین گرمی کی وجہ سے پکھے جھل رہی تھیں۔ اب انہوں نے گرم پاوریں اوڑھ لیں۔ سارا ہجوم اس حیرت ناک ڈرامے کا نکتہ عروج دیکھنے کے لیے دم سادھے بیٹھا تھا۔

بل اب بے حد تھک چکا تھا۔ اس کی ٹانگیں لرز رہی تھیں مگر اُس کی نم آلود کالی آنکھوں میں ایک عجیب قسم کی وحشت تھی۔ اس نے اپنی رہی سہی طاقت مجتمع کر کے اپنی آنکھوں کی وحشت میں بھر دی تھی۔ ایک ایسی وحشت جو بڑے بڑے بناؤ بل فائٹروں کا پتہ پانی کر دیتی ہے۔ غار بدوش بل فائٹر کا جس کا ذکر میں نے پہلے بھی کیا ہے اس معاملے میں بے حد ڈر پوک تھا۔ ایشیلیہ کے بل رنگ میں جب وہ ریشاثر ہونے سے قبل اپنی زندگی کا آخری بل قتل کرنے والا تھا تو اس نے وہ بل اپنے بچپن کے دوست کے نام کرنے کا اعلان کیا۔ "اے میرے عزیز دوست! یہ بل تمھارے نام پر قتل ہو گا۔ تم جو میرے دل میں رہتے ہو" اس نے جھک کر اپنے دوست سے کہا اور پھر اس کی نگاہ واپس بیٹھے ہوئے ایک عظیم موسیقار پر پڑی۔ گالوں نے فی الغر اپنا ارادہ بدل دیا۔ "اے آسمان موسیقی پر چکنے والے تانباک ستارے یہ بل میں تمھارے نام کرتا ہوں اور....." ابھی وہ فقرہ پورا نہ کر پایا تھا کہ اُس نے اپنے اُستاد بل فائٹر کو ہجوم میں بیٹھے دیکھا۔ "بھلا میں اپنے استاد الفابیز کی موجودگی میں یہ بل کسی اوڑھنے کے نام کرنے کی جرات کیوں کر کرتا ہوں بل تمھارے نام پر قتل ہو گا میرا استاد!"

اور پھر خطہ مول لے کر سیگوں کے اوپر ٹھک کر دار کرتا ہے۔
آخری وار کرنے سے پہلے بل فائٹر نے اپنی تلوار کو بوسہ دیا اور اس کا دستہ
آنکھوں کے پاس لاکر نوک بل کی جانب کر دی.....
”ہے تورو“ اس نے بل کو پکارا۔

بل نے بمشکل اپنا سر اٹھایا۔ دھوپ میں چمکتی ہوئی تلوار کا رخ اس کی جانب
تھا۔ انصاف کی گھڑی آن پہنچی تھی۔ انصاف جو ہمیشہ اصولوں کی بجائے طاقت
کا ساتھ دیتا ہے..... اس وقت بل فائٹر کے ہاتھ میں نگی تلوار تھی۔ بل کا سر
جھکا ہوا تھا لیکن کبھی کبھار مظلوم اپنے گہرے زخموں کے باوجود عالم سے ٹکر لے لیتے
ہیں۔ بل نے بھی اپنا جھکا ہوا سر اٹھایا اور بچی بچی طاقت سے کام لے کر بل فائٹر
پر حملہ آور ہو گیا۔ اور پھر کچھ یوں ہوا کہ انسان اور حیوان ہم آغوش ہو گئے۔ حیوان
کا سر نیچا۔ انسان اس کے سینکوں سے بچاؤ کرتے ہوئے اس کے اوپر جھکا،
تلوار گردن میں اتار دیا، بل کی گردن، تلوار کا دستہ اور انسان کا ہاتھ ایک نغظے
میں بدل گئے۔ قتل کی خوبصورتی کا وہ لمحہ جسے بل فائٹر کا فنی اور جذباتی نقطہ عروج
کہا جاتا ہے۔ بل فائٹر نے تلوار کے خون آلود دستے سے انگلیاں علیحدہ کیں اور
ہیچے ہیٹ کر کھڑا ہو گیا۔ بل لڑکھڑاہٹا تھا۔ اس کے منہ سے خون کا ایک فوارہ پھوٹا۔
اس کی آنکھیں پتھر آنے لگیں۔ کون جانے اس آخری لمحے میں بل نے نیم مردہ آنکھوں
سے کتنی نفرت سے ان ہزاروں تماشاخیوں کو دیکھا ہوگا جو اس کی موت کا تماشا
دیکھنے آئے تھے۔ بل فائٹر کو لہروں پر ہاتھ رکھے نہایت سنجیدگی سے اختتام کا
منتظر تھا۔ پورے بل رنگ پر خاموشی طاری تھی۔ بل کا سر نیچا ہوتا چلا جا رہا تھا۔
اس کی گردن اور منہ سے بہتا ہوا خون گرم ریت میں جذب ہو رہا تھا اور پھر اس
کی ٹانگیں بری طرح لرزنے لگیں اور وہ لڑکھڑاکر ریت پر گر پڑا۔ موت کے سائے
روشنیوں پر غالب آ گئے۔

بل کے گرتے ہی بل رنگ میں شور مچا ہو گیا۔ تلوار کے پہلے وار میں بل کو ہلاک کر
ڈالنا ایک عظیم کارنامہ تھا اور نہ اکثر تلوار کسی ہڈی سے چٹخ کر باہر نکل آتی ہے اور
بل فائٹر اگر اتنا ہی ہونے کی وجہ سے متغیر بار کوشش کے باوجود بھی بل کو ہلاک
کر سکے تو پھر اس کی شاہ رگ خنجر سے کاٹ دی جاتی ہے۔ لوگ اپنی نشستوں سے
اٹھ کر تالیاں بجا رہے تھے اور پھر یک دم بل رنگ میں ہزاروں سرخ رنگ کے
ریشمی رومال لہرانے لگے۔ عوام نے فیصلہ دے دیا تھا کہ بل فائٹر کو اس کی ببادی
کے صلیب میں بل کے کان اور دم کاٹ کر دے دیئے جائیں۔ صدر کی منظوری پر
بل رنگ کے ملازمین نے ایک خنجر سے بل کے کان اور دم کاٹے اور دونوں تھخے
بل فائٹر کے حوالے کر دیئے۔ یہ ایک بہت بڑا اعزاز تھا۔ اس کے فوراً بعد ہتیار
لوگ اکھاڑے میں کود پڑے اور بل فائٹر کو کندھوں پر اٹھا کر ایک جلوس کی صورت
میں بل رنگ کے ساتھ ساتھ چلنے لگے۔ تماشاخی ابھی تک کھڑے ہو کر تالیاں بجا رہے
تھے۔ جو نئی بل فائٹر ان کے قریب سے گزرتا وہ جوجی میں آتا تھا کہ اس کی جانب
اچھال دیتے۔ رومال، ہیٹ، پیکھے، کوٹ، تالیاں اور لالچاؤ دوسری اشیاء اکھاڑے
میں بھری پڑی تھیں۔

بل فائٹر کے معاونین ان چیزوں کو اٹھا کر بل فائٹر کو دیتے اور وہ انہیں چوم
کر واپس اچھال دیتا۔ میرے قریب بیٹھے دو ہسپانویوں میں سے ایک نے شراب
کا شکیزہ بل رنگ میں پینک دیا۔ بل فائٹر نے شکیزہ فضا میں ہی دبوچ لیا۔
اور اس میں سے چند گھونٹ بھر کر واپس پینک دیا۔ شکیزہ سب سے اگلی صف
میں گرا۔ ایک تماشاخی نے اٹھا کر چند گھونٹ لیے اور پچھلی صف میں کسی کو
تھما دیا۔ اُن صاحب نے بھی ”ڈیک“ لگا کر شراب پی اور اس سے پچھلی صف
میں بیٹھے ایک لڑکے کو دے دیا۔ لڑکے نے بھی..... شکیزہ موٹے ہسپانوی
تک پہنچا تو تقریباً خالی ہو چکا تھا، مگر پھر بھی وہ اپنی خوش قسمتی پر پھولا نہ سہا رہا تھا۔

میں اس مشکیزے اور بقیہ شراب کو یادگار کے طور پر اپنے پاس رکھوں گا تاکہ میرے بیٹے اور مہرنے والے پوتے اس پر فخر کر سکیں کہ یہی ہے وہ مشکیزہ جس میں سے عظیم بل فائٹر ہوئے فونٹس نے شراب پی تھی :

اور اس کے بعد دو درجن قماشائیوں نے بھی میں نے منہ سے ہوتے کہا۔
"ہاں کیوں نہیں! میرا بس چلے تو میں بل رنگ میں بیٹھے تمام قماشائیوں کو شراب پلاؤں..... تو تم بھی پیو!" اس نے مشکیزہ میری گود میں رکھ دیا۔

"اگر بقیہ شراب میں پی گیا تو تمھارے پاس اپنے بیٹوں اور مہرنے والے پوتوں کو کھانے کے لیے کچھ نہ بچے گا۔" میں نے ہچکا ہوا مشکیزہ اُسے واپس کر دیا۔

جنوس کے خاتمے پر میدان میں فرخچروں کی ایک جوڑی داخل ہوئی جسے بل رنگ کے ملازمین ہانک رہے تھے۔ انھوں نے خچروں کے گرد بندھی دسیوں سے بل کی ٹانگیں مضبوطی سے جکڑ دیں۔ اس کے بعد انھوں نے خچروں کو چابک کے ساتھ اتنی تیزی سے پٹاکا کہ وہ وزنی بل کو گھسیٹتے ہوئے میدان سے باہر نکل گئے۔ ریت پر مرے ہوئے بل کے گھسیٹنے سے ایک راستہ سا بن گیا تھا بل ٹائٹ کے ڈرامے کے مرکزی کردار کی آخری راگنڈر۔

مہربل ٹائٹ میں چھ بل اور تین بل فائٹر حصہ لیتے ہیں۔ ایک بل کو مارنے کے لیے صرف بیس منٹ جیتے جاتے ہیں۔ سان ساستیان کے اکھاڑے میں پہلا بل ہلاک ہو چکا تھا۔ اب دوسرے بل کی باری تھی۔ جگل کی آواز آئی۔ بوڑھے نے دائیں ہاتھ سے اپنا بوسیدہ ہیٹ اتار کر ماتھے کا پسینہ پونچھا۔ پھر بائیں ہاتھ سے اسٹبل کا سرخ دروازہ زور لگا کر دھکیلا اور بڑی پھرتی سے پیچھے ہٹ گیا۔ چشم زدن میں ایک بھاری بھر کم سیاہ بل بھلی کی سی تیزی کے ساتھ اُس کے بوجھ تلے زمین لرز رہی تھی۔ طاقتور، مغرور اور ناقابل تسخیر ہے تو رو، ہے تو رو! قماشائی اپنے رومال، ہیٹ اور شے ہلا کر اُسے اپنی جانب متوجہ کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔

خچروں کی جوڑی جب پھٹے اور آخری بل کی لاش اکھاڑے میں سے اسٹبل کی جانب گھسیٹ رہی تھی تو بل رنگ پر سوج مغرب ہو چکا تھا۔ کل صبح ان کا گوشت سان ساستیان کے قصا بول کی دکانوں پر میٹکے دامن فروخت ہو گا۔ میڈرڈ کے بل رنگ میں مرنے والے بل کا گوشت تو جزل ذرا کم بھی بے حد رغبت سے کھاتا ہے۔ آخری بل کی لاش میدان سے جاتے ہی قماشائی تالیاں پیٹتے اور سیلیاں بجاتے اپنی نشستوں سے اٹھ کھڑے ہوئے اور بل رنگ خالی ہونے لگا۔ میں جانے کے لیے اٹھا تو پھر ایک مرتبہ میری آنکھوں میں فلیش کی روشنی چمک گئی۔ سنہری بالوں والی لڑکی نے کیمرو اپنی آنکھ سے ہٹایا اور مسکرا دی۔ وہ بے حد خوبصورت تھی۔ مجھے معلوم تھا کہ اس طرح تصویریں اُتارنے سے اس کا کیا مقصد ہے! وہ بھی ایک ایسے کھیل کا آغاز کرنا چاہتی تھی جس میں وہ بل فائٹر ہو اور میں بل بل فائٹر جو اکثر بچ جاتا ہے اور بل جرمیشہ ہلاک ہو جاتا ہے۔

گرم خوشبو کی شام

گرمائی اس شام کو جب سان سبستیان کے حسین سمندر پر شفق سرخ ہو رہی تھی، بل رنگ میں سے ایک جوس نکلا۔ خون، دیت اور پسینے میں سنائے ہوئے بل نامزد کو تاشاتوں نے اپنے کندھوں پر اٹھا رکھا تھا۔ شفق کی سرخی میں ان کے چہرے ان بادروں کی مانند دکھائی دے رہے تھے جنہوں نے کسی قدیم رومی اکھاڑے میں جنگلی شیروں کو بچھاڑا ہو۔ موسیقاروں کا ایک گروہ ان کے گرد گھیرا ڈالے ہسپانوی موسیقی "فلیمنگو" کی تانیں اڑا رہا تھا۔ سفید بالکونیوں پر ہلکی بڑی بڑی آنکھوں والی ہسپانوی دوشیزائیں ان پر پھول بچھا کر رہی تھیں۔ میں بھی اس جلوس کے ساتھ ہولیا۔ اکثر لوگوں کے کندھوں پر شراب کے شیکرنے تھے جنہیں وہ منہ کے پاس بچکاتے تو سرخ شراب کی ایک پتی سی دھار ان کے حلق میں اتر جاتی۔۔۔۔۔ وہ اس معاملے میں بے حد فراخ واقع ہوئے تھے اور ہر ایک کو اپنا شکیزہ پیش کر رہے تھے۔۔۔۔۔ شمالی یورپ میں جہاں کہیں لوگوں کا جھگٹا ہونا میں ان سب میں اپنے گدھی رنگ اور سیاہ بالوں کی وجہ سے علیحدہ نظر آتا رہا یہاں اس ہسپانوی ہجوم میں شامل اکثر افراد پاکستانی لگ رہے تھے کبھی بھار کوئی ہسپانوی اپنی زبان میں مجھ سے بل ٹاسٹ کے بارے میں کچھ کہتا تو میں صرف مسکرا دیتے پر ہی اکتفا کرتا۔ جلوس شہر کے درمیان پلازا میٹر میں پہنچا۔ چوک کا ایک چکر لگا یا اور دھیر منتشر ہو کر اس پاس کے قمرہ خانوں اور شراب خانوں میں سما گیا۔

میں تھکے ہوئے قدموں سے سان سبستیان کے ساحل کی جانب چل دیا۔ بل ٹاسٹ نے میرے اندر ایک عجیب سی ادا سی بھر دی تھی۔ میں فیصلہ نہ کر پایا کہ اس بارے میں ہسپانوی نکتہ نظر درست ہے جو کہتے ہیں کہ اتنی ڈھیر ساری خوبصورتی کے لیے بل کا قتل جائز ہے یا ان غیر ملکیتوں کا اعتراض سجا ہے جن کے نزدیک یکھیل خشیانہ ساحلی سڑک پر غوب رونق تھی۔ بل ٹاسٹ دیکھنے کے بعد اکثر لوگ سمندر کی تازہ ہوا اور خوشگوار شام کی خشکی کا لطف اٹھانے اور حرا آنکھ تھے ساحلی سڑک بل رنگ سے شروع ہو کر پہاڑی پر واقع قلعے کے گرد چکر کاٹ کر شہر کے دوسرے سرے پر جا کر ختم ہو جاتی تھی۔ پہاڑی کی اوٹ میں کدو کے بنے ہوئے چھوٹے چھوٹے کیمپ تھے جن کو رنگ برنگے قہقروں سے سجایا گیا تھا۔ ان کیمپوں کے آگے سے ساحلی سڑک گزرتی تھی۔ سڑک کے پہلو میں خاموش سمندر لیٹا ہوا تھا۔ بیچوں کی بستی تھی۔ سارا دن ان کیمپوں میں سمندر سے پڑی ہوئی پھلی فروخت ہوتی تھی اور رات کو ان میں کوئی چھوٹی کرسیاں رکھ کر انہیں ہونٹوں میں بدل دیا جاتا تھا۔ یہاں بھی بے شمار لوگ بیٹھے خوش گپوں میں مصروف تھے۔ میں پاس سے گزرا تو لوگوں کی میزوں پر رکھی ہوئی خوراک میں سے اٹھتی ہوئی آستنا انجیر خوشبو نے میرے نفعوں میں گھس کر اعلان کر دیا کہ میاں صاحبزادے ان انگریز مائیوں کی پانی ہوئی پائے اور لیٹ کر کب کے ہضم ہو چکے۔ صرف سمندر کے کنارے چھلک بلبل کھیلنے اور بل ٹاسٹ دیکھنے سے کام نہیں چلے گا، کچھ پیٹ پوجا بھی ہو جائے۔ میں اندر چلا گیا اور بیٹھنے کے لیے کوئی کرسی تلاش کرنے لگا۔ پوری کیمپ ٹھسی پڑی تھی۔ ایک لمبی میز پر کھانے اور خاص طور پر پیسے کی چیزوں کے انبار لگے تھے۔ تمام کرسیاں پڑھیں۔ چند افراد میز پر دھڑنا مارے شیکڑوں میں سے شراب پی رہے تھے ہسپانوی موسیقاروں کا جو طائفہ جلوس کے ہمراہ تھا اب یہاں گھوم پھر کر موسیقی بجا رہا تھا اور پسینے اکٹھے کر رہا تھا۔ ایک خوش باش

موٹی تازی ویٹری میزوں کے گردیوں پھرتی سے گھوم رہی تھی جیسے چابی کی گڑیا۔
مجھے وہاں کھڑا دیکھ کر وہ میرے پاس چلی آئی۔
”کو میدا؟“ اس نے کوہلوں پر ہاتھ رکھ کر سپانوی میں پوچھا۔
”ہاں، کو میدا“ میں نے جواب دیا۔

اُس نے جھٹ سے میرا ہاتھ تھام لیا اور مجھے کھینچتی ہوئی میز کے سر پر ایک
بوٹے کے پاس لے گئی جو سر جھکاٹے اُدنگہ رہا تھا۔

”ہے انتونیو؟“ اُس نے بوٹے کا کندھا پکڑ کر زور سے جھنجھڑا۔

”کے اُتاسینز رتیا“ حضرت انتونیو ہڑبڑا کر اُدنگہ بیٹھے۔

”سالیبا“ ویٹری نے انگوٹھے سے باہر کی طرف اشارہ کر دیا۔

بوٹے نے میز پر رکھی سُرخ شراب کی بڈل بغل میں دبا لی اور آنکھیں ملتا ہوا
کیبن سے باہر چلا گیا۔ یہ بوٹھا آج دوپہر ہزاروں نگاہوں کا مرکز تھا۔ اہل طبل کا
دروازہ کھول کر ٹبل کو میدا ان میں چھوڑنے والا بوٹھا۔

”کے بائ؟“ کرسی پر بیٹھے ہی ویٹری نے جلدی سے پوچھا۔

میں نے ساتھ والے صاحب کی پلیٹ کن اکھیر سے دیکھی۔ تلی ہوئی
ننھی مٹی مچھلیاں۔

”چھٹی“ میں نے مزہ لیتے ہوئے کہا۔

”ماچی؟“ ویٹری نے غوطی پر انگلی جاکر حیرت سے پوچھا اور پھر فوراً
”ہی ہنس دی“ اُسکا دوا“

غوطی دیر میں وہ آپسکا دو یعنی مچھلی کی ایک پلیٹ لے آئی۔ ایک پیاز
ڈبل روٹی اور کسی مشروب کا ایک گم بھی ساتھ تھا۔ درجن بھر سارڈین مچھلیاں اپنی
اصلی سینت میں عین یعنی اگر وہ تلی ہوئی نہ ہوتیں اور انہیں پانی میں ڈال دیا
جاتا تو فوراً تیرنے لگتیں۔ میں نے ایک کو انگلی سے چھوا۔ بے حد گرم تھی۔ سروا

دوم کو علیحدہ کر کے میں نے اُسے ڈبل روٹی کے بیچ میں رکھا اور پیاز کے ساتھ کھلنے
لگا۔ بے حد خستہ اور مزیدار تھی۔ استنبول میں بچنے والی مچھلی کی طرح..... میرے
گرد بیٹھے ہوئے لوگ مچھلی کھانے کے ساتھ ساتھ ہاتھ ہلا کر آج کی ٹل فاسٹ کے
بارے میں گرم گرم بحث کر رہے تھے۔

”چوتھے ٹل کی دائیں آنکھ کمزور تھی۔ بزدل بھی تھا۔“ میں نے پیاز چباتے
ہوئے یونہی ہانک دی۔

تمام لوگ خاموش ہو گئے۔

شاید میں نے غلط کہہ دیا تھا۔ میں نے بشکل پیاز نگلا اور شرمندہ ہو کر کہا۔

”میں نے غور نہیں کیا۔ ہو سکتا ہے بائیں آنکھ ہو۔ بل شاید بہادر.....“

”نہیں نہیں“ ایک تنومند سپانوی نے منہ کھول کر ایک سالم مچھلی اس میں

گرائی اور میرے کند سے پر ہاتھ رکھ دیا ”تم ٹھیک کہتے ہو، دائیں آنکھ کمزور تھی او
وہ بزدل تھا۔ ہم بھی تو اسی بات پر بحث کر رہے تھے۔“

میں نے اطمینان کا سانس لیا۔

”آبا“ میز کے آخری سرے پر بیٹھے ایک صاحب نے میری جانب اشارہ

کر کے دونوں ہاتھ ہوا میں بلند کر دیئے۔ ”انکسی نادو“

انکسی نادو اس شخص کو کہا جاتا ہے جو ٹل فاسٹ کا شوقین ہو اور اُسے خوب

سمجھتا ہو میں نے انکسی نادو کا خطاب ملنے پر ایک سالم مچھلی نگلی لی۔ دوم آنکھوں

اور سر سمیت۔ ذائقہ قدرے مختلف تھا۔

جب کبھی ویٹری آتی ایک دل چھینک بوٹھا سینے پر ہاتھ رکھ کر کوئی رومانوی

مکا لے ادا کرنے لگتا۔ تمام لوگ بے حد مظلوم ہوتے اور ویٹری بھی آنکھیں ملکا کر

ہنستی ہوئی چلی جاتی۔ ہمارے سامنے ساحلی مشرک پر بے شمار لوگ بے مقصد گھوم

رہے تھے۔ چند ایک میری طرح تلی ہوئی مچھلی کی خوشبو کے آگے ہتھیار ڈال دیتے

اور جب میں کتے ٹولتے کہیں کے اندر آجاتے۔ شرک کے ساتھ ہی میٹلا سمندر شروع ہو جاتا تھا۔ سمندر کے درمیان سانسٹا کلا راکا خوبصورت جزیرہ کھڑا تھا، جس کی مدھم روشنیاں گھپ اندھیرے میں جگنوؤں کی مانند ٹٹھار ہی تھیں۔ بائیں ہاتھ پر سان سباستیان کی کونپا بچ کے کنارے منگے ہوٹلوں کی عمارتیں بجلی کے بڑے تقوں سے روشن تھیں۔ ساحل کے ساتھ پھیروں کی بے شمار کشتیاں پانی میں جھول رہی تھیں۔ انہی کشتیوں میں پکڑی جانے والی پھلی اس وقت تلی ہوئی حالت میں میری پلیٹ میں موجود تھی۔ لہروں کی نرم چھپاک چھپاک کہیں میں بیٹھے ہوئے لوگوں کے شوکے باوجود مجھ تک پہنچ رہی تھی۔ ایک دم میرے حلق میں کانٹا چبھ گیا میں نے بے دھیانی میں شاید پھلی کو اچھی طرح ٹٹولا۔ ٹٹولا تھا۔ لگ اٹھا کہ میں نے جلدی سے ایک دو گھونٹ نکل لیے۔ عجیب قسم کا مشروب تھا۔ میں نے لگ اٹھا کہ سو گھٹا۔ سفید رنگ کا شربت تھا شاید۔

”شراب نہیں ہو سکتی۔“ میں نے سوچا۔ ”شراب تو کڑوی ہوتی ہے۔“

موسیقاراب میں میرے سر پر کھڑے کوئی گیت الاپ رہے تھے۔ گیت میں اُدا سی اور محرومیت کی پرچائیاں تھیں۔ میں نے جب سے پانچ بیسیتے کا ایک سکن کال کر گٹار بجانے والے کو متنا دیا۔

”گر ایسا سنبور!“ اس نے جھک کر کہا اور وہ آگے بڑھ گئے۔

سمندر سے آتی ہوئی نم اور خوشگوار ہوا کہیں میں بیٹھے ہوئے خوش باش لوگوں کی ہنسی اور گفتگو کا بلا جلا شور، ہسپانوی موسیقی اور گرم پھلی۔ بات ہوئی نا۔ میں نے سوچا۔ اور پھر مجھے لاہور کی کڑکتی گرمیوں کی وہ دوپہر یاد آگئی جب میں مارا سارا دن اپنی دکان پر بیکار بیٹھا سامنے سے گزرنے والی گرد و دھول شرک کو بے دھیانی سے تختہ رتنا۔ بس یونہی باہر دیکھتا رہتا۔ بیکاری اور بوردیت، کبھی کبھار کوئی ریڑھیاں تانے لگے گزرتا اور چپکتی دھوپ میں گھوڑے کی گردن میں

بندھی گھنٹیوں کی آواز ویز تک متعلق رہتی۔ شرک کے پار پان سگریٹ کی دکان کا گنبا ٹاکٹ بچتی پان کی گھوری منہ میں ٹھونسے اُڑ گھر رہا ہوتا۔ ساتھ والا سبزی فروش تاج ایک گندے ٹین میں گدلا پانی بھر کر اپنی باسی سبزیوں پر چھڑکتا اور پھڑٹا۔ پھا کر وہیں سر جاتا۔ مرل اور خارش زدہ آوازہ کتے میری دکان کے آگے فٹ پاتھ پر چپکے دوپہر کے کھانے کی ہڈیاں سونگھتے اور پھر منہ میں دبا کر دم ہاتے شربت والے حکیم صاحب کی دکان کے تھڑے کے نیچے جا بیٹھتے۔ سلام باؤ جی! شرک کا خاکروب! مجھے ہمیشہ سلام کر کے گزرتا۔ اُسے ہر جمعرات کو ایک اٹھنی ملتی تھی۔ اور پھر ریڑھیوں پر پھل لگا کر بیچنے والوں کی مسلسل آوازیں ”آنے پا۔ آنے پا۔ کھانا نہیں کھانا مٹھے بڑے جے۔“ چار آنے سیر بجانے وہ کیا بیچتے تھے میں اپنے ذہن کا درہچا آہستہ سے کھول دیتا اور پھر اس سے پرسے یہ درتپے خود بخود کھل جاتے۔ ہر ایک میں سے یادوں کے حسین لمحے انگوٹھی لے کر بیدار ہو جاتے اور باہر جھانکنے لگتے۔ سرنگر کی جھیل میں کنول کے چوڑے پتے، واوٹی نیلم کی نیلی جھیلیں، روم کے فواروں کی پھوار، دیباٹے سین کے کنارے ایک حسین شام، سوٹز لینڈ کی جھیل..... آنے پا۔ آنے پا۔ کھانا نہیں کھانا، مٹھے بڑے جے..... ذہن پر یکدم ہتھوڑے چلتے اور تمام درتپے کھٹا کھٹ بند ہونے لگتے۔ پچھلے پہر سامنے والا پٹاری دکان سے باہر آکر اوپر مکان میں سوئے ہوئے اپنے کاہل بچے کو لگاتار آوازیں دینے لگتا۔ یوسف اوتے، اوتے یوسف۔ ”میرے ذہن کے درتپوں کے کوڑا زور لگانے سے بھی نہ ٹھکتے..... پیرس کا پھولوں کا بازار آنے پا.....“ ذہن کے گندولے چار آنے سیر۔ سوٹز لینڈ۔ یوسف اوتے یوسف! سب کچھ گڈ ہو جاتا۔ اور اب اس وقت اسان سباستیان کے سمندر سے آتی ہوئی نم اور خوشگوار ہوا۔ سانسٹا کلا راکے جزیرے میں چمکتے ہوئے جگنو۔ ہسپانوی موسیقی اور گرم پھلی، لیکن کب تک! یہ سب کچھ بھی تو عارضی ہے۔ پھر وہی کڑکتی گرمیوں کی

دوپہریں ہوں گی۔ گرد آلود شرک ریڑھے اودھنا گئے، پتلی پان فروش، تاج سبزی والا، بریل آواہ کہتے، لاوارث گائیں، شہرت والے حکیم صاحب، خاکروب، سلام باؤجی، سان ساستیان کی ایک شام آنے پائل فاسٹ چار آنے میرا سپانیوٹ اونے۔
یوسف۔

کیم روشنی ہوئی..... فلیش..... میری آنکھیں چند حیا گئیں۔ میں لاہوکی گوالڈی سے چلک جھپکتے ہی سان ساستیان کے حسین ساحل پر تھامیز کے سرے پر وہی بل فاسٹ والی لڑکی کیمرو آنکھوں سے لگائے بیٹی تھی۔ دو خوش شکل سپانوی لڑکے اس کے ساتھ کھڑے تھے لڑکی نے کیمرو آنکھوں سے ہٹایا اور ہاتھ ہلا کر زور سے کہنے لگی "جیلو بل" تمام لوگ ہنسنے لگے۔ میں نے نظریں نیچی کر لیں۔ سنری بالوں والی لڑکی آنے پا۔

کھانے سے فارغ ہو کر میں نے سگریٹ سلاگ لیا اور ساحل سمندر پر بے مقصد گھومنے والوں کو بغیر کسی مقصد کے دیکھنے لگا۔

"آہم! دیکھئے۔" میں نے فوراً مڑ کر پیچھے دیکھا۔ کالے سوٹ اور باؤلر سیٹ میں ٹبوس ایک نوجوان انگریز اکڑا کھڑا تھا۔ "اگر آپ بڑا زمانہ میں تو میں آپ سے کچھ دریافت کرنا چاہتا ہوں۔"
"فرمائیے!"

"کیا یہ....." اُس نے پیٹ میں پڑے مچھلیوں کے سروں کی طرف اشارہ کیا۔ "مچھلی کھانی جاسکتی ہے؟"

"مچھلی کھانی جاسکتی ہے، یہ صرف اس کے سرو اور دھبے ہیں۔" میں نے مسکرا کر جواب دیا۔

"شاید آپ بڑا مان گئے۔" اس نے نہایت سنجیدگی سے کہا "میں لندن سے بذریعہ ہوائی جہاز آج ہی سان ساستیان پہنچا ہوں۔ مجھے چونکہ سپانوی خوراک

کے بارے میں کچھ زیادہ علم نہیں، اس لیے کھانے سے قبل تحقیق کر لینا مناسب جانا۔" بنیازوں اور کھلے گئے کی قمیضوں میں ٹبوس اس سپانوی ہجوم میں کسی لاک ٹیل پارٹی کے لیے موزوں لباس پہنے یہ صاحب بالکل جھنڈا لگ رہے تھے۔

"میں بھی آج ہی پیرس سے یہاں آیا ہوں۔" میں نے ڈبل روٹی کا ایک ٹکڑا چباتے ہوئے کہا۔ "تلی ہوئی سارڈین مچھلی بے حد مزیدار ہے اور صرف بیس پیسے میں۔"

"لیکن سارڈین تو کبھی تل کر نہیں کھائی جاتی۔ اس قسم کی مچھلی تو صرف مہر کے میں جھگوڑیوں میں بند کرنے کے لیے موزوں ہے۔" اس نے ابلائی ہرنٹ دانٹوں میں دبا کر لا پر وہی سے کہا۔

"آپ اپنی شکایت اس کین کے مالک پھیرے سے کیجئے، اس میں میرا کوئی قصور نہیں۔" میں قد سے جھجھکا گیا۔

"شاید یہ کرسی خالی ہے۔" اُس نے میرے ساتھ والی کرسی کی طرف اشارہ کیا۔ اور پھر جیب سے سفید رومال نکال کر کرسی کی سطح پر پونجی۔ ہیٹ اتار کر میز پر دھرا، بالوں پر ہاتھ پھیرا اور اکڑ کر کرسی پر بیٹھ گیا۔

"بور کریں گے یہ حضرت۔" میں نے دل میں سوچا اور پھر سمندر میں جھولتی ہوئی کشتیوں کی طرف دیکھنے لگا۔

"یہ ویٹر کس کجنت کہاں چلی گئی ہے۔ اس رستوران کی سروس اتنی بُری ہے کہ اگر لندن میں ہو تو ایک دن نہ چلے۔" وہ اپنی ٹائی کی گرہ درست کرتے ہوئے ناک چرٹھا کر بولے۔

اکثر اگر پریسیاج جب یورپ کی سیر کو نکلتے ہیں تو ان کے دماغ میں بطلانیہ کی گمنائی ہوئی غفلت کا کوئی عود کر آتا ہے۔ وہ یورپ میں بسنے والی ہر قوم میں کیڑے نکالتے ہیں۔ جرمنوں کو آداب کا علم نہیں۔ فرانسیسی کیچورے کھاتے ہیں،

اعلاوی گرہ کٹ ہوتے ہیں اور ہسپانیوں کے جسم سے بڑا آتی ہے۔ وہ اپنی پوری پھٹیاں گردن اکڑائے، ہر شے پر ناک بھونچ دھکتے لندن کے بوسیدہ شراب خانوں کی یاد میں آہیں بھرنے گزار دیتے ہیں، بلکہ ایک انگریز بوڑھا تو ہر اتوار کو پیرس صرف اس لیے جایا کرتا تھا کہ وہاں کی "انگلش پیب" میں بہترین انگریزی شراب ملتی ہے۔ یہ صاحب بھی شاید اسی قبیل کے تھے۔

تھوڑی دیر بعد ویٹرس کا ادھر سے گزر ہوا تو اس نے آرڈر پر پھنسنے کا تردد کئے بغیر ٹرسے میں رکھی درجن بھر پیٹیوں میں سے ایک ان ایٹھے ہوئے صاحب کے آگے سے ماری۔

"لیکن دیکھیے..... میں نے کہا میں!" انھوں نے گھبراہٹ میں ویٹرس کو پکارا مگر وہ واپس جا چکی تھی چنانچہ مجھ سے مخاطب ہو گئے "مگر میں نے تو یہ ڈش نہیں منگائی۔ ویٹرس کا اخلاقی فرض تھا کہ وہ کھانا لگانے سے قبل مجھے میز دکھاتی۔" "اس رستوران میں میز وغیرہ نہیں ہوتا۔ صرف ایک ہی ڈش ملتی ہے۔ گرم سارڈین پھل۔" میں نے ان کی طرف متوجہ ہوئے بغیر اکتا کر کہا۔ یہ صاحب سان باستیا کی ایک خوبصورت شام کا ستیا ناس کرنے پر تھے ہوتے تھے۔

"نیم ٹیم" صاحب نے پھلی منہ میں ڈالتے ہی چٹنا سے لینے شروع کر دیئے اور پھر یکدم سینے پر ہاتھ رکھ کر کھڑے ہو گئے۔ "آپ سے معافی کا خراستگار ہوں۔ میں نے بلاوجہ آپ پر شک کیا۔ ایسی مزیدار پھلی تو ہاؤس آف لارڈز میں بھی نہیں ملتی۔"

"ہاؤس آف لارڈز؟" میں نے حیران ہو کر پوچھا۔ مجھے پہلے ہی شک تھا کہ یہ صاحب کوئی گڑھے ہوئے لارڈز قسم کی چیز ہیں۔

"ہاں! ہاؤس آف لارڈز؟" انھوں نے ڈبل روٹی کے کڑے سے پھلی کا مصالہ پونچھتے ہوئے کہا۔ "میں وہاں پچھلے دس برس سے ویٹری کی حیثیت میں ملازم ہوں۔"

تو وہ لارڈز کی بجائے لارڈز کے ویٹری تھے تبھی کھانے اور سرویس کے بارے میں اتنی چھان چھٹک ہو رہی تھی۔

پھلی ختم کرنے کے بعد صاحب نے ایک بوتل سُرخ شراب چڑھائی اور باقاعدہ بہک گئے۔ میں نے تو ہاؤس آف لارڈز کے خشک کردوں میں اٹھتے ہوئے کھوسٹ بوڑھوں کو چار بجے کی پانے پلاتے پلاتے زندگی برباد کی سے زندگی ترا سے کہتے ہیں! انھوں نے میز پر بیٹھے بے ٹکڑے ہسپانیوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "مگر سارڈین پھلی، سُرخ شراب، سمندر کی خوشگوار ہوا اور..... میرا توجہ چاہ رہا ہے کہ ہاؤس آف لارڈز کی میرا گیری چھوڑ کر یہاں ایک کشتی خرید لوں اور سارڈین پھلیاں کپڑا کروں۔"

"ٹیک خیال ہے؟" میں نے اکتا کر کہا۔ میں اب سوچ رہا تھا کہ ان صاحب سے کسی طرح پچھا چھڑا کر ہسٹل کی راہ لوں۔

"معاف کیجئے گا۔" وہ لڑکھڑا کر اٹھے۔ اپنی مائی اتار کر جیب میں رکھی اور کوٹ اتار کر میز پر رکھ دیا۔ میز پر پڑے ہوئے میٹ کو اٹھا کر انھوں نے قریب سے گزرتی ہوئی ویٹرس کے سر پر جما دیا۔ ویٹرس نے آنکھیں میٹ کاٹیں اور میٹ اتار کر ان کی غالی بوتل پر ٹکا دیا۔

ایک اور فلیش ہوا۔ بلی فاسٹ والی محترمہ۔ وہ میز سے اٹھ کر اپنے ہسپانوی دوستوں کے ساتھ باہر جا رہی تھی۔ "خدا حافظ بلی! اس نے جلتے جاتے کہا۔"

"شاید اس محترمہ سے آپ کی دعا سلام ہے۔" صاحب نے مجھے ٹھوکا دیا۔ "ہاں! بلی فاسٹ میں ملاقات ہوئی تھی؟"

"بلی فاسٹ؟ نہایت ظالمانہ کھیل ہے؟" انھوں نے منہ بنا لیا۔ "میں بھی آج دوپہر دیکھنے کی نیت سے گیا تھا۔ معلوم ہوا صرف تین سو پیسے والا مکمل مل سکتا ہے..... ایک بلی فاسٹ میں چھ بلی، یعنی پورے پچاس پیسے کا ایک بلی پڑا۔ مہنگا

سودا تھا۔ کیوں جناب؟ پچاس پیسے میں ایک شریف بُل کو قتل ہوتے دیکھنا کہاں کی عقلندی ہے؟ اس رقم سے سارڈین پھلی کی دو پیٹیں آسکتی ہیں۔ سارڈین پھلی؟ ہاں سارڈین..... دیٹرس جانے کہاں مرگئی ہے میں ایک پیٹ پھلی اور کھادنگ بلکہ سُرخ شراب..... وہ باتیں کہنے جا رہا تھا۔ ہاں سُرخ شراب..... ہسپانیہ کی سُرخ شراب۔ دیٹرس! میں خود اسے ڈھونڈ کر لاتا ہوں۔“

صاحب نے خالی بوتل جس پر بیٹ انکا ہوا تھا، اٹھائی اور دیٹرس کی نکاحش میں باورچی خانے کی جانب چل دیئے۔ میں نے یہ موقع غنیمت جانا اور وہاں سے اٹھ کر ساحلی سڑک پر آگیا۔ چند ایک عیز کی جوڑوں کے علاوہ سڑک پر اب بے حد کم لوگ رہ گئے تھے۔ میں پیدل ہی ہوٹل کی جانب روانہ ہو گیا۔ اگر یہ سب عارضی ہے تو بھی کیا! سائنٹا کلارا کے جزیرے میں ٹھکانے والے جگنو زندگی کے تاریک لمحوں میں چمک اٹھیں گے۔ اس خوبصورت شام کی ٹھنڈی ہوا لاہور کی چیتی دوپہروں میں بھی میرے رخساروں سے چمک رہے تھے۔ اور سکون کا احساس دلائے گی میں نے اپنے اندر خوبصورتی کا ذخیرہ کر لیا ہے اور یہ خوبصورتی مجھے اُنے والی کل کی دشواریوں کا سامنا کرنے کے قابل بنا دے گی۔

ہوٹل کے قریب پہنچ کر میں نے مُردہ ساحل کی جانب نگاہ کی۔ سان باسٹیان کے آسمان پر چمکنے والے تارے اور سائنٹا کلارا کے جگنو آپس میں گلے مل رہے تھے۔

بد بخت قشتالیہ

سائنٹا کلارا کے جزیرے اور اس کے گرد و نواح میں پھیلے ہوئے وسیع سمندر پر گہری دھند چھائی ہوئی تھی۔ اگلاؤ اور اُرگل پہاڑیوں کی چوٹیوں پر گھنے اور سیاہ بادل اُترے ہوئے تھے۔ ساحلی سڑک کے فٹ پاتھ پر گئے ہوئے درختوں کے تنوں میں سے پانی نچڑ رہا تھا۔ کوسچانیچ بالکل ویران پڑی تھی۔ سمندر کا پانی اُتر جانے سے دُور دُور تک ایک دلدل سی بن گئی تھی۔ چھپروں کی بستی بھی دھند کی لپیٹ میں آئی ہوئی تھی۔ سائنٹا کلارا کے ساحل پر انگریز کشتیاں سمندر میں تلاطم کے باعث بُری طرح ڈول رہی تھیں۔

آج صبح جب میں پاپلونانا جانے کی غرض سے یوٹھ ہوٹل سے باہر نکلا تو پھلی شب کا نیلا آسمان گھنے بادلوں سے ڈھکا ہوا تھا اور ہلکی ہلکی پھوار پڑ رہی تھی۔ ساحلی سڑک تک پہنچتے ہی تیز بارش شروع ہو گئی اور مجھے ایک ہوٹل کے برآمدے میں پناہ لینا پڑی۔ مجھے ان انگریز بوڑھیوں کا خیال آگیا جن کی مدد سے ہم نے کل صبح کرنسی تبدیل کر دئی تھی۔ وہ ضرور اس وقت ہوٹل کے منیجر پر برس رہی ہوں گی۔ پیڈرو کے بچے تم نے ہماری چھٹیوں کا ستیاناس کر دیا ہے۔ سان باسٹیان میں تو پچھلے میں روز سے لگا تار بارش ہو رہی ہے۔“

میں نے سامان کے خیلے میں سے ہسپانیہ کا نقشہ نکالا اور اپنے سفر کے راستے کا تعین کرنے لگا۔ آج شب پاپلونانا میں بسر ہوگی۔ کل شام تک ہسپانیہ کے صدر

یونین جیک لہرا رہا تھا اور ڈرائیور کی نشست پر ایک عجیب الخلق قسم کی شے براہمان تھی۔ اس کے بھوسے بال کندھوں تک آئے ہوئے تھے اور گھنی داڑھی چھاتی پر اُگے ہوئے بالوں سے الجھ رہی تھی۔ گھٹنوں تک آئی ہوئی ایک براؤن نیکر کے علاوہ ان صاحب کے جسم پر اور کوئی لباس نہ تھا۔ اس نے وہیں بیٹھے بیٹھے سر سے پاؤں تک میرا جائزہ لیا اور پھر انگلیوں سے داڑھی میں گنگھی کرتے ہوئے کہنے لگا یہاں جاؤ گے؟

”پامپونا“ میں نے بارش سے بچاؤ کی خاطر شتر مرغ کی مانند سر جھیب کی چھت کے نیچے کر لیا۔

”پام پام لونا؟“ اس نے اپنی گھنی بھنوں پر ہاتھ ہٹے حیرت سے پوچھا۔

میں نے پامپونا کے بچے کے سمجھانے کی کوشش کی۔

”ایک منٹ۔ میں نقشہ دیکھ کر تمہیں بتاتا ہوں کہ یہ پام پام.....“ اس نے جیب کے پچھلے حصے میں سے ہسپانیہ کا ایک بوسیدہ نقشہ نکالا اور اپنے گھٹنوں پر پھیلا کر اس پر انھیں گھمانے لگا۔

یہ سڑک پتہ نہیں کہاں جاتی ہے؟“ خاصی دیر بعد اس نے نقشے پر پڑی ایک بھوری کیر پر انگلی جھاتے ہوئے حیرت سے کہا اور پھر اُسی لحظہ منکھول کر منسنے لگا ”ہا ہا۔ سڑک نہیں یہ تو میری داڑھی کا ایک بال ہے..... ہو ہو چھوٹا سا لطیفہ ہو گیا۔“

”اور یہ جو بڑا سا لطیفہ باہر کھڑا بارش میں بھیگ رہا ہے اس کے بارے میں کیا خیال ہے؟“ میں نے تنک کر کہا۔

”اوہ سوئی.....“ باہر تو بارش ہو رہی ہے۔ جھمی جھپ میں بیٹھ جاؤ باہر کیوں کھڑے ہو۔ میں تمہیں پام پام لونا میں اتار دوں گا۔“

”بہت خوب“ میں نے خوش ہو کر کہا اور جھپ کے اندر گھسنے لگا۔

مقام میڈرڈ پیچ جاؤں گا۔ وہاں سے میرا ڈش دریا سے وادی الکبیر کے آہستہ روپانیوں کے کنارے آباد بزرگ شہروں قرطبہ اور اشبیلیہ کی جانب ہو گا اور پھر غرناطہ۔ جہاں اہل کے پرفسوں ایوان، غلام گریشیں اور سرخ برج میری راہ تک رہے تھے..... مجھے تسخیر لینے کے لیے! پہلے تو میرا ارادہ تھا کہ میں بذریعہ ہسپانویا تک سفر کروں مگر یو تھ ہوٹل میں مقیم ایک فرانسیسی سیاح نے مجھے سچ ہانگنگ کے ذریعے سفر کرنے کا مشورہ دیا۔ بقول اس کے ہسپانیہ میں لفٹ حاصل کرنا چنداں دشوار نہ تھا۔ چنانچہ اب میں پامپونا جانے والی شاہراہ کی تلاش میں ادھر آنکلا تھا۔ بارش قد سے دھیمی ہوئی تو میں نے نقشہ لپیٹ کر پھیلے میں رکھا اور باہر سڑک پر آگیا۔ تنوڑی دور چلنے کے بعد ایک سڑنگ آئی۔ یہ سڑنگ سان سائین کی حد آخر تھی۔ سڑنگ کے دوسری جانب میں نے سامان سڑک کے کنارے نم آلود گھاس پر رکھا اور کھڑے ہو کر لفٹ کا انتظار شروع کر دیا۔ بارش کی جھ سے سڑک پر ٹریفک بہت کم تھی۔ ایک دو کاریں ٹرکین گمران کی منزل ہسپانیہ کی بندرگاہ بلباؤ تھی جو پامپونا سے بالکل مخالف سمت میں واقع ہے۔

مجھے وہاں کھڑے تقریباً دو گھنٹے گزر گئے مگر کوئی لفٹ نہ ملی۔ بارش کا پانی درختوں کے پتوں میں سے برس برس کر میری برساتی کے کنارے کے اندر تک جا رہا تھا۔ میں دل ہی دل میں اس فرانسیسی سیاح کو کوس رہا تھا۔ اگر میں اس کے مشورے پر عمل نہ کرتا تو اس وقت یہاں بھیگنے کی بجائے پامپونا کے کسی آرام دہ تھو خانے میں بیٹھا گرم گرم کافی پی رہا ہوتا۔ خاصی دیر بعد سڑنگ میں سے ایک جھپ نکلی۔ میں نے انگوٹھے کو خم دے کر ہاتھ آگے کر دیا۔ جھپ پہلے تو تیزی سے میرے پاس سے گزر گئی مگر جانے ڈرائیور کو کیا خیال آیا، اس نے ایک دم بریک لگائی اور مجھ سے کافی فاصلے پر جا کر رُک گیا۔ میں نے جلدی سے سامان کا تھیلہ کا ندھے پر ڈالا اور بھاگتا ہوا جھپ کے پاس پہنچ گیا۔ مڈگار ڈپر بلانزی

”ایک منٹ“ اس نے ہاتھ اُگے کر دیا۔ ”چرس تو نہیں پیتے؟“
 ”نہیں“ میں نے سر جھٹک کر بے صبری سے کہا بیری کو پچھا جوں مینہ برس
 رہا تھا۔

”پھر ٹھیک ہے“ اس نے ہاتھ نیچے کر لیا۔ ”اپنا سامان پچھلے حصے میں رکھ دو
 اور میرے برابر میں بیٹھ جاؤ۔“
 جیب کے پچھلے حصے پر لنڈے بازار کی کسی دکان کا گمان ہوتا تھا۔ کڑی
 کے شتیر بکھیتی باڑی کے اوزار، پٹرول کے جیری کن، نالتو ٹائر، کھائے اور
 مختلف سائزوں کی لمبی لمبی چھریاں بے ترتیبی سے بھری پڑی تھیں۔ میں نے
 اپنا سامان کا تھیلا درمیان میں رکھ کر اُسے ایک پُرانے کوٹ سے ڈھانپ دیا۔
 اور پھر اگلی نشست پر بیٹھ گیا۔ اس نے جیب شارٹ کر دی۔

چند فلائنگ پلنے کے بعد اس نے بریک پر پاؤں رکھ دیا۔ ”میں تمہیں ایک
 بات بتانا ہی بھول گیا تھا“ اس نے اپنی جھاڑی نما ٹوکھوں کو منہ کے آگے
 سے سمیٹتے ہوئے کہا ”تمہیں پٹرول کی قیمت بانٹنا ہوگی“
 ”میرے پاس اتنی رقم ہوتی تو میں بس پر سفر کیوں نہ کرتا؟“ میں نے
 جھنجھلا کر کہا۔

”پھر مجبوری ہے۔“ اس نے سیٹرنگ پر ہاتھ مار کر فیصلہ سنایا۔

پلے توجی میں آئی کہ ان مولانا کو بے نقط سنا کر فوراً جیب سے اُتر جاؤ۔
 بھلا بیچ بائنگ میں بھی ”مفتا“ نہ لگے تو اتنی خواری سے فائدہ؟ مگر پھر خیال آیا
 کہ بارش ابھی تک جاری ہے اگر شام تک کوئی اور لفٹ حاصل نہ کر سکا تو یہیں کو
 واپس ہوٹل تک پیدل ہی جانا پڑے گا۔

”مجھے منظور ہے۔“

میں جو پہلے دُکھا بیٹھا تھا اب ٹانگیں پھیلا کر نشست پر نیم دراز ہو گیا اور

سگرٹ سٹگا کر مزے سے کش لگانے لگا۔ اگر کوئی شخص ازراہ نوازش بلفٹ کی پیشکش
 کرے تو دوران سفر آپ کا رویہ اُس جملے آدمی کے ساتھ نہایت ہی عاجزانہ قسم
 کا ہوتا ہے۔ اُس کی ہر بات پر ہاں میں ہاں ملانا اور تمام سوالوں کا جواب بھاری
 سے دینا آپ پر فرض ٹھہرتا ہے مگر یہاں تو معاملہ ہی اُلٹ تھا۔ اگر مجھ پر پٹرول کی
 قیمت ادا کرنا واجب قرار دیا گیا تھا تو پھر دھڑتے سے سفر کرنا بھی میرا حق بنتا تھا۔
 ”جالی گڈ“ ہارلش صاحب بے مدغوش ہوئے ”میرا نام ٹونی ہے۔ ویسے
 ایک سگرٹ تو ملاؤ۔“

”سگرٹوں کی قیمت بھی بانٹنا ہوگی۔“ مجھے مستنصر کرتے ہیں۔ ”میں بھی کھینک پر اُتر آیا۔“
 ”رائٹ یو آر اولڈ بوائے“ اس نے ایک زوردار تھقہ بلند کیا اور جیب
 شارٹ کر دی۔

”آج سے صرف دس روز پہلے تک میں لندن میں ایک قصائی کی دکان پر
 ملازم تھا۔“ اس نے میری ڈوبیا سے سگرٹ نکال کر سگایا اور اپنے بائیں
 ہاتھ سے لگا۔ سارا دن اور جتنا تک کی گائیوں اور یارک شائر کے شوروں کی بوٹیاں
 کاٹتا اور شام کو کسی شراب خانے میں جو کی شراب چڑھانے کے بعد جھومنا ہوا اپنے
 کمرے میں جا کر سو رہتا۔ البتہ سفتے کی شب کو میں رقص کرنے کے لیے چلا جایا کرتا۔
 جس لڑکی کو بھی رقص کی دعوت دیتا وہ ناک چڑھالیتی۔ دراصل یوڈی کوئون کی
 پوری شیشی انڈیل لینے پر بھی میرے جسم میں سے گوشت کی بو آتی رہتی تھی۔ پھر پچھلے
 ہفتے اخبار میں ایک اشتہار نظر آیا۔ ”ہوڈیشیا کی سفید فام حکومت کو مقامی آبادی
 کے مقابلے میں اپنا تناسب بڑھانے کی غرض سے سفید فام کاشت کاروں کی ضرورت
 تھی۔ مالی اعانت کے علاوہ دوسرا ایک زمین بلا معاوضہ دینے کا اعلان بھی تھا میں
 نے سوچا افریقہ کی کھلی فضاؤں میں رہنے سے کم از کم میرے جسم میں رچی گوشت
 کی بو زائل ہو سکے گی چنانچہ جمع شدہ پونجی سے یہ پُرانی جیب خریدی اور کمرے کا

طلوسا کا قصبہ آیا تو ٹوٹی نے ایک دوکان سے باسک کسانوں کی روایتی ٹوپی خرید کر پہن لی۔ وہ اس ٹوپی میں کسی یہودی کی مانند لگ رہا تھا۔

طلوسا سے نکلے تو پیرائیز کا پورا سلسلہ کوہ کچھ یوں نظر کے سامنے آیا جیسے میرپتال کے فٹ پاتھ پر بیٹھے کسی فوٹو گرافر کا منقش پردہ..... بلند پہاڑ، چمکتی ندیاں اور سرسبز وشت، ہمالیہ اور الپس کے بعد دنیا کا سب سے مشہور پہاڑی سلسلہ۔

اسنی پیرائیز کو جنحیں عربی زبان میں برت کہتے ہیں عبدالرحمن الغافقی نے عبور کیا اور فرانس پر حملہ آور ہوا۔ مینی بال اپنی فوج اور سینتیس ہاتھیوں سمیت ان پہاڑوں میں سے گذر کر روم کی جانب بڑھا۔ فرانس کے بادشاہ شارلیمان نے اندلس کے مسلمان سرداروں ابوالاسود، ابن حبیب اور عامل العربی کی شہ پر پیرائیز پار کئے اور سر قسط کا محاصرہ کر لیا۔ یہ سردار عبدالرحمن الداخل کے مخالفوں میں سے تھے۔ اس دوران میں جرمنوں نے فرانس پر حملہ کر دیا اور شارلیمان کو سر قسط کا محاصرہ اٹھانا پڑا۔ فرانس پس جاتے ہوئے جب وہ پیرائیز کے بلند درہ رانسے دویں سے گزر رہا تھا تو شام کے دھندلکے میں ہزاروں باسک کسان اور مسلمان سپاہی گرد و نواح کی چٹانوں سے قبریں کر ٹوٹ پڑے اور پوری فرانسیسی فوج کو تیرتھ کر دیا۔

درہ رانسے دویں کی اس خون آشام شب نے رولینڈ کی کماوت کو جنم دیا۔ کہا جاتا ہے کہ شارلیمان رانسے دویں سے گذرتے وقت اپنی فوج کی قیادت کر رہا تھا۔

فوج کے عقب میں رولینڈ اور دوسرے فرانسیسی سردار چلے آ رہے تھے۔ مسلمان حملہ آور ہوئے تو رولینڈ نے اپنا بگ اتنی قوت سے بجایا کہ اس کے پیچھے پھڑے پھٹ گئے۔ بگ کی آواز پورے پیرائیز میں گونج گئی۔ میوں دودر شارلیمان کو خطرے کا علم ہو گیا اور وہ جان بچا کر فرانس پہنچنے میں کامیاب ہو گیا۔ ان دنوں شاید فرانسیسیوں کے پیچھے پڑے قدرے کمزور تھے کہ یک مرتبہ بگ بھونکنے سے بھٹ جاتے تھے ورنہ اس زمانے میں تو مشہور حبشی بگل فراز ٹوٹی ایسٹر انگ

نصف صدی سے زائد بگل بجانے کے بعد جب مراٹو دل کے عارضے سے نہ کہ پیچھے پڑے پھٹنے سے۔ بہر حال درہ رانسے دویں فرانسیسیوں کو مکمل شکست ہوئی اور ہجرت چند افراد کے کسی نے فرانس کا منہ نہ دیکھا۔ شارلیمان اس شکست سے اتنا بددل ہوا کہ پھر بھی اندلس کا رخ نہ کیا بلکہ امیر اندلس کی خوشنودی حاصل کرنے کی خاطر اپنی بیٹی اس کے حرم میں دینے کی پیشکش بھی کر دی۔

اب پھر بارش شروع ہو گئی۔ ہمارے بائیں ہاتھ پر درختوں کے ایک ٹھنڈی ایک چمکتا ہوا دریا نظر آیا اور غائب ہو گیا۔ جیپ کی رفتار تیز ہو گئی۔ ہم نشیب کی جانب جا رہے تھے۔ ٹھوڑی دُور چلنے کے بعد بھگت سڑک ہموار ہو گئی۔ ہم ایک وسیع میدان میں داخل ہو رہے تھے۔ سڑک کے دائیں ہاتھ پر ایک بلند چٹان آئی۔ چٹان کی چوٹی پر ایک بیل کا مجسمہ نصب تھا جس پر پامپلونا کے الفاظ تحریر تھے۔ کچھ اور آگے گئے تو اس عظیم میدان کے بیچ پامپلونا کا شہر نظر آنے لگا۔ کلیساؤں کے مینار اور گنبد بارش میں بھیگ رہے تھے۔ ایک دم چاروں طرف کھڑے پہاڑوں کی چوٹیوں پر اٹکی ہوئی گہری دھند میدان میں اترنے لگی اور ہم اس کے نرسے میں آگئے۔ ٹوٹی نے جیپ کی تباہی جلا دی۔

پامپلونا زارامورلے کا صدر مقام ہے۔ کوہ پیرائیز کے دامن میں دریائے آرگا کے کنارے آباد اس شہر کو روم کے سپہ سالار پومپی نے از سر نو تعمیر کیا اور اسے پومپیلو کا نام دیا۔ عرب اسے بملونا کہتے تھے۔ امیر عبدالرحمن جب پورا ہسپانیہ زیر کرنے کے بعد اس شہر میں داخل ہوا تو ہر سوسنا ٹھپایا ہوا تھا۔ عیسائی امیر عبدالرحمن کی بیٹیاں شجاعت سے خوف زدہ ہو کر شہر خالی کر چکے تھے۔ مسلمانوں کے عہد میں یہاں کے حبشی گورنر عثمان ابن ابی نسع نے اپنی بیوی جو کہ ڈیوک آف یوٹوس کی لڑکی تھی، کے اکسانے پر علم بغاوت بلند کر دیا۔ امیر اندلس عبدالرحمن الغافقی نے شہر دی ابن زبیاں کو یہ بغاوت فرو کرنے پر مامور کیا۔ نسع نے شکست کھائی اور

ایک چٹان سے کود کر خودکشی کر لی۔
ہم پامپونا کے مرکزی چوک میں ایک قہوہ خانے کے برآمدے میں بیٹھے کافی پی رہے تھے۔ ٹوٹی ایک ننھے ننھے ہسپانوی لڑکے سے "لمپیا تو تاس" یعنی بڑا پش کروا رہا تھا اور میرے ذہن میں ارنسٹ ہینگو سے کے ناول "فی استا" کے لازوال کردار انگریز ایمیاں لے رہے تھے۔ شراب کی ریسیڈی بریٹ، اخبار نویس جیک، یہودی کوہن اور لیڈی بریٹ کا دلیرانہ ٹیگزٹراٹک۔ وہ سب پامپونا کے جشن سان فرمین میں شرکت کے لیے پیرس سے آئے تو اسی چوک میں واقع ہوٹل مونٹایا میں ٹھہرے جشن شروع ہونے سے ایک روز قبل فواری علاقوں کے کسان فروخت شدہ فصل کی رقم سے مالا مال بسوں میں بیٹھ کر شہر میں آتے اور پھر اس کی تنگ گلیوں میں واقع شراب خانوں میں سما جاتے اور پھر جلائی کے پیلے ہفتے میں جشن سان فرمین پامپونا کے غیر موثر شہر پر ایک دھماکے کی صورت میں وارد ہو جاتا۔ سات روز کے لیے دن اور رات کا تصور ختم ہو جاتا۔ شہر کے کوچہ و بازار میں رقص و موسیقی کی محفلیں برپا ہوتیں۔ شراب نوشی حد سے زیادہ تجاوز کر جاتی۔ لوگوں کے شور و غوغا سے کان پھٹنے کو آتے۔ اسی جشن کے دوران میں لیڈی بریٹ ایک نوخیز بل فائٹر کے دام الفت میں گرفتار ہوتی ہیں کہیں..... شاید اسی قہوہ خانے میں ان دونوں کی پہلی ملاقات ہوئی تھی۔

جشن کی سب سے بڑی خصوصیت "بھینسوں کی دوڑ" ہوتی ہے۔ پو پھٹنے کے ساتھ ہی شہر کے ٹاؤن ہال سے ایک راکٹ چھوٹتا ہے اور اس کے پھٹنے ہی شہر سے باہر واقع اصطبل کے دروازے کھل جاتے ہیں۔ چھ خونخوار بھینسے ڈکراتے ہوئے باہر نکلتے ہیں اور پامپونا کی ایک مخصوص گلی میں دوڑنے لگتے ہیں نتیجہ راستے کے دونوں طرف کڑی کی ایک باڑھ کھڑی کر دی جاتی ہے تاکہ بھینسے اوجھڑ نہ نکل جائیں۔ یہ راستہ سیدھا ٹیبل رنگ کو جاتا ہے۔ اسی دوپہر کو یہی چھ بھینسے ٹیبل

اس دیوانچی کا جواز بھی یہیں مل فائٹنگ کی طرح ہسپانوی مزاج میں ملتا ہے۔ ہر آدمی تو بل فائٹر نہیں بن سکتا چنانچہ وہ اپنی زندگی خطرے میں ڈال کر بھینسوں کے آگے دوڑ کی "لگاتا ہے" اور اپنا شوق پورا کرتا ہے اور تو اور کئی غیر ملکی بھی مردانگی کے اس مظاہرے میں حصہ لینے کے لیے سارا سال اس لمحے کے انتظار میں رہتے ہیں جب وہ بھینسوں کے آگے سر پٹ بھاگ رہے ہوں گے اور ان کے کانوں کے پرچے پھیکا کرتے ہوئے خونخوار جانوروں کے سموں کی دھمک سے لرز رہے ہوں گے۔ بھینسوں کے آگے دوڑنے کے لیے سفید قہقہے ٹینس شوز اور سرخ رومال روایتی لباس ہے ٹینس شوز تیز دوڑنے کے لیے اور سرخ رومال بھینسے کو اشتعال دلانے کے لیے۔ سیاحت پر نکلنے سے پہلے پامپونا کے جشن سان فرمین میں شرکت کرنا اور ہر روز ان بھینسوں کے آگے دوڑنا میرے پردگرام میں شامل تھا، مگر بدقسمتی سے چند ناگزیر وجوہات کی بنا پر میں وقت پر نہ پہنچ سکا۔

یہ سنگامہ خیز جشن جس مقدس ہستی سینٹ سان فرمین کے نام پر برپا جاتا ہے اس بھلے آدمی کا صرف اتنا قصور تھا کہ اس نے پامپونا کے باشندوں کو یہی

بنانے کی غلطی کی تھی۔

پامپلونا کا مرکزی چوک جہاں جشن کے دوران میں کھوے سے کھو اچھلتا ہے اب تقریباً خالی پڑا تھا۔ قہرہ خانوں کے برآمدوں میں بھیجی کرسیوں پر ویٹر گاہکوں کے انتظار میں بیٹھے اور نگہ رہے تھے۔ میں نے قہرہ خانے کے مالک سے اس بے روشی کا سبب پوچھا تو وہ اُداس ہو کر کہنے لگا۔

”پامپلونا پورے سال میں جشن سان فرمین کے دوران میں صرف سات روٹے لیے آباد ہوتا ہے اور پھر الیا اُجڑتا ہے کہ پورے ہسپانیہ میں اس سے ویران شہر نہیں ملتا۔ ویسے اس مرتبہ تو کمال ہی ہو گیا۔ پورے چھ آدمی بھیسنوں کی ڈوڑ میں ہلاک ہوئے اور سب کے سب غیر ملکی“

وہ ناگزیر وجوہات جن کی بنا پر میں جشن سان فرمین میں شرکت نہ کر سکا تھا، مجھے یکدم بے حد سوزین ہو گئیں۔

”پام پام لونا میں رہ کر کیا کرو گے؟“ لونی نے جواب تک ”لمپیا لونا“ کر دیا تھا، ”سراٹھا کر کہا“ میرے ساتھ میڈرڈ کیوں نہیں چلتے؟“

میں خود اس اُجڑے دیار میں شب بسر کرنے کے بارے میں کچھ زیادہ سنجیدہ نہ تھا مگر میڈرڈ تک پہنچتے پہنچتے یکبخت جیپ تو ہزاروں پسینوں کا پھول ہضم کر جائے گی، میں نے سوچا۔

”ذاتی طور پر تو مجھے یہ شہر پسند ہے“ میں نے دھڑکتے دل سے اپنا کیس مضبوط کرنے کی خاطر لا پر دانی سے کہا۔ ”لیکن اگر تم اصرار کرتے ہو تو پھر ٹھیک ہے؟“ ”یو آر اے سپورٹ؟“ اس نے اپنی ڈھکی ہوئی نیکر انگلیوں میں اُداس کراد پر چڑھائی اور کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا۔

”لیکن ایک شرط ہے“ میں نے ہنس کر کہا۔ ”میں پٹرول کی نصف قیمت کی بجائے صرف تیسرا حصہ ادا کروں گا“

”منظور ہے؟“ اس نے وارمھی کھجا کر کہا ”اب پلاڈ ایک سگرٹ..... اور تم بھی سگرٹ کے پیسے پٹرول کی قیمت میں سے وضع نہیں کرو گے، ہو گیا نا ایک چھوٹا سا لطیفہ؟“

ہم شہر سے باہر نکلنے لگے تو لونی نے چمڑے کی ایک دکان کے سامنے جیپ روک لی اور دندنا تا ہوا اندر چلا گیا۔ تھوڑی دیر بعد وہ بغل میں ایک چمڑا ہوا چمڑے کا مشیزہ دلے برآمد ہوا۔ اس نے ادھر ادھر دیکھا اور پھر سڑک پار کر کے ایک غینے قہرہ خانے میں گھس گیا۔ وہاں سے باہر نکلا تو اس کے کاندھے پر دھرا مشیزہ ایک جونک کی مانند پھول کر کپا ہو رہا تھا اور اس پر سُرخ شراب کے قطرے ٹپک رہے تھے۔

”اسی پستے میں یہ مشیزہ اور اس میں بھری ہوئی سُرخ شراب“ اس نے بڑے پیار سے مشیزے کی نم آلود سطح پر ہاتھ پھیرا اور اُسے جیپ کے پچھلے حصے میں رکھ دیا۔ ”ہسپانیہ میں شراب کی ارزانی دیکھ کر جی چاہتا ہے کہ رہو ڈیشیا جانے کی بجائے یہیں رہ جاؤں“ وہ بے حد مسرور نظر آ رہا تھا۔

پامپلونا سے نکلنے کے بعد کچھ دور تک تو ہم اس پیلا ٹاویلیع اور سرسبز میدان میں سفر کرتے رہے پھر آہستہ آہستہ ہرے بھرے کھیت چیل میدانوں میں بدلنے لگے اور چھوٹی پہاڑیاں خشک اور بلند پہاڑوں کی صورت اختیار کرتی گئیں کہیں کہیں پائن اور کاراک کے درخت بھی نظر آتے۔ کوہ پیرانیز میں سرایت کر وہ خشکی دھیرے دھیرے ہمارے جسموں میں سے نائل ہو رہی تھی اور اب قدرے گرمی کا احساس ہو رہا تھا۔ ادھر لونی کی جیپ بھی ہر تیس چالیس میل کے بعد پیاس سے نڈھال ہو کر کھڑی ہو جاتی اور اس میں گیلن پٹرول ڈلوانا پڑتا۔

دوپہر کے وقت ہم نے ایک چھوٹی سی ندی عبور کی۔ میں نے نقشے میں دیکھا دریاے ابرو تھا۔ رومیوں سے قبل اس دریا کا نام اُمیرٹس تھا اور اس کے کنارے

بے والے لوگ آئیں گے کہلاتے تھے۔ ہسپانیہ کا قدیمی نام آئبیریا اسی دریا سے اخذ ہوا۔ اس کے بعد قلعہ ہورا کے قصبے سے گزر ہوا جہاں ہشام کے عہد میں بغاوت ہوئی۔ اس بغاوت کو ابن غالب نے فرو کیا۔

قلعہ ہورا سے نکلنے ہی خشک اور بلند پہاڑوں کا ایک لامتناہی سلسلہ شروع ہو گیا۔ وحشت ناک اور بے آب و گیاہ۔ دور دور تک آبادی کا نام نشان نہ تھا۔ یہ قشتالیہ تھا۔

قشتالیہ کا مطلب ہے قلعہ۔ اس صوبے کو قلعہ اس لیے کہا گیا کہ ہسپانویوں کے بقول یہ سرزمین ایک حصار کی صورت میں مسلمانوں کی یلغار کو روکے رہی۔ فرڈیننڈ اور ازابیلا جنہوں نے ہسپانیہ میں مسلمانوں کی آخری سلطنت غرناطہ کو سرنگوں کیا قشتالیہ ہی کے فرمانروا تھے۔ کہا جاتا ہے کہ ہسپانیہ کی عظمت قشتالیہ کے باشندوں اور ذرائع کی مرہون منت تھی۔ قشتالیہ دوبہ زوال ہوا تو ہسپانیہ کی عظمت بھی گنا گئی۔ قشتالیہ کی موجودہ ہسپانگی اور زبوں حالی کے بارے میں ہسپانوی شاعر انترنیو مجادو لکھتا ہے۔

بدبخت قشتالیہ

بیٹے دنوں میں تو کتنا عظیم تھا

گراب

تو چیتھڑوں میں لپٹا ہوا ہے

بحر پہاڑوں اور چیلیل میدانوں میں بگولے اٹھ رہے تھے اور پاکستان کی چیلانی گرمیوں ایسی تو سے ہمارے چہرے جھلے جا رہے تھے۔ میں نے اپنی سفید برساتی توپا پہنا کر چلتے وقت ہی اتار دی تھی گر اب گرمی کی شدت سے قمیض کے اندر میرے جسم پر پسینے کے قطرے رینگ رہے تھے۔ ٹونی کی تقلید کرتے ہوئے میں نے بھی نام کپڑے اتار کر ایک نیچر پن لی۔

جس شرک پر ہم سفر کر رہے تھے وہ بیحد نامہوار تھی۔ چھوٹے چھوٹے کنکر اور پتھر ٹائمروں کی زد میں اگر گولی کی مانند نکلتے اور جیپ کے نچلے حصے پر ترزاخ ترزاخ برسے گئے۔ شاید یہ شرک بھی ان دنوں کی یادگار تھی جب قاضی ولی محمد کا دھڑ سے گزر ہوا تھا۔ وہ اپنے سفر نامے میں لکھتے ہیں۔ ہسپانیہ کی بعض شہرکیں تو اس قدر خراب ہیں کہ کھنڈ کی سڑکوں کو مات کرتی ہیں۔ جیپ کی دند سکریں ہر چند منٹ بعد گرد سے اٹ جاتی اور ٹونی کو اسے اپنی ایک پرانی قمیض سے پونچھ کر صاف کرنا پڑتا۔ قلعہ ہورا سے ہم تقریباً چالیس میل دور آچکے تھے مگر اس دوران کسی آبادی یا پٹرول پمپ وغیرہ کا نام و نشان تک نہ ملا اور نہ ہی اس شرک پر اور کوئی کار یا ٹرک دیکھنے میں آیا کیسے کجبار گرد و زجاج کے خشک پہاڑوں میں کیسے کہیں حصول اطمینان نظر آتی۔ یہ دھول ہماری نظروں سے اوجھل کسی گھاٹی میں بیٹھروں کے ریوڑ کے پلنے سے اٹھ رہی تھی۔ ڈان کے خوتے نے بھی لا مانچا کے میدانوں میں اسی قسم کی دھول اٹھتی دیکھی تو اس نے یہ تصور کر لیا کہ دشمن کی لاقعد اور فوج اس کی جانب بڑھ رہی ہے۔ چنانچہ اس عمر رسیدہ خدائی فوجدار نے اپنے گھڑے روزی نانتے کو تھپکا اور نیزہ تان کر اس خیالی دشمن پر حملہ آور ہو گیا۔ ویسے ڈان کے خوتے تو کیا کوئی بھی شخص اگر اس بے آب و گیاہ ویرانے کی تپتی ہوئی دوپہروں میں ہوش نہ ہو کہو بیٹھے تو بعید نہیں۔ ٹونی بار بار جیپ روک کر مشکیزے سے سرخ شراب کے چند گھونٹ نگلتا اور پھر اپنی ڈاڑھی میں سے پسینہ نچوڑ کر جیپ چلانے لگتا۔ اس کی آنکھیں گرمی سے سرخ ہو رہی تھیں۔

چاند کی سطح جیسی اس وحشت ناک اور ویران سرزمین پر ہر طرف ہوکا عالم طاری تھا۔ صرف جیپ کے انجن کی آواز اس ویرانے کے خوابیدہ سکوت کو باقاعدگی سے جھنجھوڑ رہی تھی۔ ہسپانیہ کا نصف سے زائد رقبہ اسی قسم کے خشک پہاڑوں اور دھول سے اٹے ہوئے ٹیلوں پر مشتمل ہے۔ سوئٹزرلینڈ کے بعد ہسپانیہ یورپ

کابل میں ترین ملک ہے۔ یونانی جغرافیہ دان سٹرابون نے سپانیہ کے جغرافیائی ممالک اور زمین کی رنگت کو مد نظر رکھتے ہوئے اسے دیوار پر کچھنی ایک بھینس کی کھال سے تشبیہ دی تھی۔ کہیں کہیں زیتون کے گروہ اور دباغ بھی نظر آ جاتے۔ پرمردہ اور اوس۔ زیتون اور دباغ ایسے خوشگوار الفاظ ذہن میں اُترتے ہی جو دکش سماں بندھنا ہے وہ انتہائی گمراہ کن ثابت ہوا۔ اس بد صورت جھاڑی نمائندگی کو تو درخت کہنا ہی زیادتی ہے۔ ہمارا لکیر اس آسیب زدہ درخت سے کہیں خوشنما ہے لکیر کو زرد پھل بھی تو لگتے ہیں۔

مخالف سمت سے ایک ٹرک نمودار ہوا اور دھول اڑاتا ہوا ہمارے پاس سے گزر گیا۔ یورپ کے کسی ملک میں پہلی مرتبہ ایسی بے کراں وسعتوں کا احساس ہوا جو صرف ایشیائی ملکوں کا خاصہ ہیں۔ یوں لگتا تھا جیسے ہم قندھار سے ہرات جا رہے ہوں۔ ویران خدائی وسعتیں، دھول، بجولے..... صرف کونجی غار بدوشوں کے سیاہ خیموں کی کمی تھی۔ آخر کار ایک قصبے سے گزر رہا ہوں لگتا تھا جیسے یہاں طاعون کی فضا پھیل چکی ہے اور یہاں کے باشندے گھر بار چھوڑ کر کہیں اور چلے گئے ہیں۔ ہر سو ویرانی برس رہی تھی۔ وحشت ناک اور ڈراؤنا جیسے انکار برہمن کی کسی آسیب زدہ فلم کا اجڑا ہوا گھاؤں۔ رکنے کو جی نہ چاہا۔ میں پسینے میں شرابور اُدھکتا رہا اور ٹوٹی مشین سے میں سے شراب کے گھونٹ بھرتا۔ اپنی ڈاڑھی کھجالتا جیب چلاتا رہا۔ ہم دونوں سر سے پاؤں تک دھول میں اٹے ہوئے تھے۔ ایک دم جیب ٹک گئی۔

”کیا ہوا؟“ میں بڑا کراٹھ بیٹھا۔
 ”چر دل ختم ہو گیا ہے۔“ اس نے ٹیڑھ پر ہاتھ مار کر سنایت لاپرواہی

میری تو سنی تم ہو گئی۔ اب کیا ہو گا؟

میری توہنی محم ہو گئی۔ اب کیا ہوگا؟

”کچھ بھی نہیں“ وہ جیب کے پچھلے حصے میں سے ایک خیری کمین نکال لایا۔ میرے پاس پٹرول کا ناسا ذخیرہ موجود ہے۔ ویسے میرے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ اس کی ضرورت افریقہ کی بھائے یورپ کے ایک ملک میں پڑ جائے گی۔

میں نے پچاس پیسے کا ایک نوٹ ٹوٹی کی طرف بڑھا دیا۔ ”میرا حصہ“

”رہنے دو، وہ ہنس کر کہنے لگا۔ اگر آج شب تک زندہ و سلامت رہے تو میرا چمڑے کا مشینہ شراب سے بھر دینا، تقریباً خالی ہو چکا ہے۔ ہو گیا نا“

”تھوڑا سا لطیف؟“

جیپ پٹرول سے تھرہو کٹارٹ ہوئی تو پھر اکتا دینے والا گرم سفر شروع ہو گیا۔ گرد اور گرنا کا تو یہاں مناسب انتظام ہے۔ میں نے سوچا گلاوگوستان بھی دستیاب ہو جائے تو ملتان کے مزے ٹوٹتے..... یہاں نیز کے بارے میں میرے تصورات پٹا کھائے تھے۔ اگر یہی لائنڈس ہے تو اللہ معافی دے۔ یہ عرب کچھ زیادہ ہی مبالغہ آرائی سے کام لیتے ہیں۔

تو کسے تجھ پر سے، جیپ کی تپتی ہوئی نشست، گرو کی متیں، ٹونی کی کھل نما واڈھی، میرا ننگا جسم جھلس رہا تھا۔ جسم میں چنگاریاں سی چھوٹنے لگیں۔ حلق سٹو کھنے لگا۔ مجھے شدت کی پیاس لگ رہی تھی۔ ٹونی تو اپنا حلق بچی کچی شراب کے قطروں سے تر کر رہا تھا مگر مجھے تو ٹھنڈے پانی کا ایک گلاس درکار تھا۔ صرت سادہ پانی کا ایک گلاس۔ اور یا پھر شاید کہیں اس پاس ہی کوئی راہٹ چل رہا ہو۔ جس کے ”گتے“ کی متواتر ٹٹ ٹٹ کی سُر ملی آواز وہاں تک میری راہبری کھے۔ شیشم کی تالیاں بجاتے پتوں کے سائے میں چپا حیدر چارپائی ڈالے حتیٰ کے کش لگا رہا ہو اور سانفہ ساتھ اپنی انیچیروں کی سی آواز میں راہٹ کے اگے جھٹے بیڑوں کو پیاسے ہنکار رہا ہو ”اومے تیزوں کوہ کے کھاواں۔ اومے مری توں!“ مجھے دُور سے چمٹنڈی پر آتے دیکھ کر وہ اٹھ کھڑا ہوا ”اے بسم اللہ منصرف آیا اے“

کوئی چڑیل ہو۔ جھریلوں کے تانے بانے میں اس کا منہ حیرت سے کھلا ہوا تھا۔
 ”پانی..... آکوا؟“ میں نے ڈرتے ڈرتے ہتھیلی لمبوں سے ٹپکتے ہوئے
 اپنا منہ سمجھانے کی کوشش کی۔ اس کے انفاس زدہ بوڑھے چہرے
 پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

”مومنو! اس نے انگلی سے اشارہ کیا اور چادر بٹھالتی ہوئی مکان کے
 اندر چلی گئی۔

بحری اب میانے کی بجائے اپنے آگے پڑے زیتون کے پتوں پر منہ مارنے
 لگی۔ صحن میں بازہ قلعی کی محک تھی تیز دھوپ کی وجہ سے سفید دیواروں پر نظر نہ
 ٹھہرتی تھی۔ تھوڑی دیر بعد بڑھیا باہر آئی تو اس نے دونوں ہاتھوں میں دودھ
 سے لبالب ایک مٹی کا پیالہ تمام رکھا تھا۔
 ”پانی؟“ میں نے پھر پوچھا۔

”اے بیچے! اس نے پیالہ میرے آگے کر دیا۔

عام حالات میں بکری کے دودھ کے نام سے ہی مجھے اب کافی آجاتی ہے مگر
 شاید یہ ہسپانوی بکریاں ہمارے ہاں کی بکریوں سے زیادہ تمذیب یافتہ
 ہوتی ہیں۔ اس دودھ نے بے حد مزہ دیا پھر میں بھی ڈان کے خوتے کی مانند
 تصورات کی دنیا میں مبتلا تھا اور بکری کے دودھ کو ستوا اور شکر کا شربت سمجھ کر
 پی گیا۔ دودھ ختم کر کے میں نے قیمت ادا کرنے کی نیت سے نیکر کی جیب سے
 دس پیسے کا ایک نوٹ نکالا۔

”نادار! نادار! بڑھیا نے انکار میں زور زور سے سر ہلایا۔

”مگر اسیا۔ گراسیا“ میں نے بھی زور زور سے سر ہلایا اور نوٹ جیب میں
 ڈال کر واپس سڑک پر آ گیا۔

دھوپ میں چلتی ہوئی گرد و آلود سڑک حد نظر تک سیدھی چلی جا رہی تھی۔

اور اپنی تھکر کی گھڑی سر پر جاتے ہوئے بیلوں کی کوٹھڑی میں سے ایک پٹنی نکال
 کر لے آئے..... اسی راہٹ کے پانی سے سینچے ہوئے جو کے ستوا اور چچا حیدر
 کے کھردرے ہاتھوں سے چھیلے ہوئے گتے کی شکر ستوا اور شکر..... اور پھر
 کمزئیں کا خنک پانی..... پاپاں۔ ایک پرانی کٹارا کا رجبے ایک بوڑھا پاوی
 چلا رہا تھا ہارن دیتی ہمارے پاس سے گزر گئی۔ شاید گرمی کی شدت سے میرا دماغ
 چٹا جا رہا تھا ورنہ میں تو صلیح گجرات پاکستان کی بجائے صلیح قشتالیہ میں تھا لیکن حال
 یہاں کوئی راہٹ ہو بھی تو وہاں چچا حیدر کی بجائے کوئی مونچھوں والا موٹا ہسپانوی
 سو مبر و مہیٹ پہنے بیلوں کو ہٹکانے کے لیے ”اونے مریں توں“ کی بجائے
 ”سے تورو۔ سے تورو“ کی رٹ لگا رہا ہو گا اور جو کے ستوا کی بجائے جو کا پانی یعنی
 شراب اٹھالائے گا۔

سڑک کے بائیں ہاتھ پر گہرائی میں سفید رنگ کا ایک گھر نظر آیا۔ صحن میں نیتون
 کا ایک گرد و آلود درخت سر جھکائے کھڑا تھا۔

”سے ٹونی!“ میں نے ماتھے سے پسینہ پونچھتے ہوئے مکان کی جانب اشارہ
 کیا۔ ”جیب کھڑی کرو شاید وہاں سے پانی مل سکے۔ مجھے بے حد پیاس لگی ہے۔“
 ”مشکل ہے“ اس نے بریک پر پاؤں رکھ دیا۔ ”بہر حال کوشش کر دیکھو اگر
 مل گیا تو مشکیزہ بھی بھر لانا۔ جیب کا انجن بھی گرم ہو رہا ہے۔“

میں نے خالی مشکیزہ اٹھایا اور جیب سے باہر نکل آیا۔ تیز دھوپ میرے بدن
 کو چھید گئی۔ جیب کے انجن کی آواز گرد و فراخ کے خشک پہاڑوں میں گونج کر
 ایک ہولناک سا تاثر دے رہی تھی۔ میں آہستہ آہستہ قدم رکھتا کھڈ میں اترا اور
 مکان کے صحن میں چلا گیا۔ زیتون کے درخت کے ساتھ ایک کالی بکری بندھی ہوئی
 تھی جو مجھے دیکھتے ہی میانے لگی۔ اتنے میں دروازہ کھلا اور کالی چادر میں لپٹی
 ایک پستہ قد بڑھیا باہر نکل آئی تو اس کی شکل بے حد ڈراؤنی تھی جیسے ”میکتھ“ کی

”یہ تم ہاتھ پھیلا کر سڑک پر اس طرح کیوں کھڑے تھے؟ دُور سے یوں لگتا تھا، جیسے ادھیڑ کو مکالمے کرنے کی تیاری کر رہا ہے۔ ٹونی نے ڈاڑھی کھجلا کر پوچھا۔“
”میں لمبی ڈاڑھی والے زیوس دیوتا کا استقبال کر رہا تھا۔ میں نے اپنے بے پناہ غصے پر قابو پاتے ہوئے کہا۔“

”مجھے افسوس ہے کہ تمہیں یہاں انتظار کرنا پڑا۔“ اس نے معذرت کی۔ ”تم پانی کی تلاش میں گئے تو موٹر سائیکل پر سوار ایک کسان مجھے یہاں کھڑے دیکھ کر رُک گیا۔ میں نے اس سے جیپ کے ریڈیو ایئر میں ڈالنے کے لئے پانی کے بلے میں پوچھا تو وہ مجھے یہاں سے کچھ فاصلے پر ایک پُرانے قبرستان میں لے گیا جہاں مُردوں کے زمانے کا ایک کنواں تھا۔۔۔۔۔ بس وہیں دیر ہو گئی۔ اس کی ڈاڑھی میں سے پانی نچڑھاتا تھا۔ جیپ میں پانی ڈالنے کے علاوہ شاید وہ خود بھی ہنا کر آیا تھا۔“

”مُردوں کے زمانے کا کنواں؟“ میں نے دلچسپی لیتے ہوئے پوچھا۔
”سینکڑوں برس پیشتر اس علاقے پر بڑی بڑی پگڑیوں والے وحشی مُرد حکمران تھے۔ انہوں نے مسافروں کی سہولت کے لیے تمام بڑی شاہراہوں کے کنارے ہر چند کوس کے فاصلے پر کاروان سراہیں اور کنوئیں بنوائے۔ مجھے اس یادری نے بتایا تھا۔“

”کنوئیں کا پانی ضرور ٹھنڈا ہو گا؟“

”اں! کافی اور پُرانی اینٹوں کی ملی بلی باس سے مکتا ہوا خشک پانی۔ لیکن تمہیں یہ کیسے معلوم ہے کہ کنوئیں کا پانی ٹھنڈا تھا؟ ٹونی نے حیرت سے پوچھا۔
اب میں اُسے کیونکر بتاتا کہ یہ میرے چچا جبر کا کنواں تھا۔“

اس قبرستان میں کنوئیں کے اُس پاس کوئی فیروزہ بھی تھا؟ میں نے قدسے توقف کے بعد منہ سے ہونے دریافت کیا۔

بالکل خالی۔ ٹونی کی جیپ وہاں موجود نہ تھی۔ میرے ماتھے پر چمکتے پسینے کے قطرے یکدم جُھم میں بڑھے اور ٹپ ٹپ میری آنکھوں میں گرنے لگے۔ نیکیوں اور گرم آب کیا ہو گا؟ مجھے یقین تھا کہ ٹونی میرے سامان سمیت وہاں سے چپت ہو گیا ہے۔
عام طور پر میں اپنے دونوں کیرے ہر وقت اٹھائے پھرتا تھا۔ پاسپورٹ اور پیسے بھی ہمیشہ جیب میں رہتے۔ مگر آج میں نے بیکر پہننے کے بعد پتلون جیب کے پچھلے حصے میں پیسٹک دی تھی۔ پاسپورٹ اور پیسے اسی میں تھے۔ کیرے بھی وہیں رکھے تھے۔ میرے سامنے ایک سنان سڑک دھوپ میں لیٹی ہوئی تھی۔ ارد گرد خشک اور بخر پہاڑ سر اٹھائے کھڑے تھے۔ ہر سو ایک ہولناک سناٹا طاری تھا۔ صرف گرم ٹوکی سائیں سائیں اور شاید میرے دل کے دھڑکنے کی آواز۔ دھک دھک۔۔۔۔۔
اب کیا ہو گا؟ دھک! میں بدبخت قشتالیہ کی پتھر ملی زمین پر آگ برساتے آسمان تلے بے یار و مددگار کھڑا تھا۔ میرا کُل سرمایہ ایک نیکر، دس پیسے کا ایک نوٹ اور ایک خالی چمڑے کا شکیزہ تھا۔ کیا قشتالیہ ہمیشہ مسلمانوں کے لیے منحوس ہی ثابت ہو گا؟ اُس پاس کہیں سایہ بھی نہ تھا۔ ٹونی چھوٹے چھوٹے لپیٹے کرتا میرے ساتھ ایک بہت بڑا لطیفہ کر گیا تھا۔ میرے ذہن میں بے حد خوفناک خیال آرہے تھے۔
قشتالیہ اور چچا حیدر کے رابطے کے درمیان پڑتے ہوئے درجنوں ممالک کے کسٹم آفیسر مجھے آنکھیں دکھانے لگے۔ پاسپورٹ؟ پاسپورٹ؟ وہ سب چیخ رہے تھے۔ میں پیرس، وینس، استنبول اور تھران کے بازاروں میں ہاتھ پھیلائے کھڑا تھا۔ مجھے بھیک دو میرے ساتھ ایک بڑا سا لطیفہ ہو گیا ہے۔ میرا وارغ پکڑنے لگا۔ تقریباً آدھ گھنٹے کے بعد وہ سڑک پر دُھول اُٹنی۔ شاید کوئی سڑک آ رہا تھا۔ میں ہاتھ پھیلا کر سڑک کے درمیان کھڑا ہو گیا۔ جیپ بھی میرا جی پا ہا کہ میں پاگلوں کی طرح تھمتے لگانے شروع کر دوں۔ ہاں ہاں یہ ٹونی کی جیپ تھی۔ جو سنی جیپ میرے پاس آ کر رُکی۔ میں جلدی سے اندر آ کر بیٹھ گیا۔

کہا۔ "مرکزی چوک، دو سڑکیں، دو اینس ہاتھ کی سڑک پریسری گلی نمبر ۳۲۔
اس دوران میں اس کا ساتھی گھوٹے سے اتر کر جیپ کا جائزہ لیتا رہا، اور
بڑے اہتمام سے اپنی ڈائری پر کچھ لکھتا رہا۔ اُس نے جیپ کے پچھلے حصے میں
جھانکا مگر خوش قسمتی سے اُسے ٹونی کی چھریاں دکھائی نہ دیں ورنہ مصیبت کھڑی
ہو جاتی۔ کہا جاتا ہے کہ گارڈیا سول کو بس پانیہ میں داخل ہونے والے ہر غیر ملکی کے
نام پتے اور رڈ ٹ کا علم ہوتا ہے۔

جب ہم گارڈیا سول کے بنائے ہوئے پتے پر پہنچے تو وہاں کسی روایتی یوتھ ہوسٹل
کی عمارت عمارت کی بجائے ایک سنایت جدید طرز کی پانچ منزلہ بلڈنگ کھڑی
تھی۔ میں جیپ سے اُترا اور بیشیے کے بڑے دروازے کے ساتھ ناک چپکا کر اندر
دیکھنے کی کوشش کی۔ کچھ بھی دکھائی نہ دے رہا تھا۔ مکمل تاریکی..... میں نے
مینڈل گھمایا تو دروازہ کھل گیا۔ عمارت کا وسیع ہال بھائی بھائی کر رہا تھا کاؤنٹر
بھی خالی پڑا تھا۔ وہاں کوئی بھی نہ تھا۔ میں جلدی سے باہر آ گیا۔

"ٹونی میرا خیال ہے کہ ہم غلط جگہ پر آ گئے ہیں۔ یہ عمارت تو بالکل ویلن
پڑی ہے۔ ویسے بھی اتنی جدید اور وسیع عمارت یوتھ ہوسٹل نہیں ہو سکتی۔"
"نمبر ۳۲ تو یہی ہے" ٹونی جیپ سے اُترتے ہوئے بولا۔ "چلو ایک مرتبہ
پھر دیکھ لیتے ہیں۔"

"کوئی ہے؟" میں نے اندر داخل ہوتے ہی منہ پر ہاتھ رکھ کر زور سے کہا میری
آواز سے پوری عمارت گونج اٹھی "ہے ہے ہے۔"
"ہو ہو ہو" ٹونی کاؤنٹر کے ساتھ دوسری منزل کو جاتی ہوئی میٹر جیپوں پر کھڑا
ہو کر یوہنی ہو ہو کرنے لگا۔

"مجھے تو یہ عمارت آسیب زدہ لگتی ہے" میں نے ہال میں رکھے آرام دہ صوفے
پر دھپ سے بیٹھتے ہوئے کہا۔

کے دیہات میں انجی نفرت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ وہ بے پناہ قانونی اور
غیر قانونی اختیارات کے مالک ہیں۔ اُن کا ایک اشارہ کسی غریب کسان کی
عمر بھر پابند سلاسل رکھنے کے لیے کافی ہے۔ ہسپانیہ کے کسی کونے میں چلے جائیے
گارڈیا سول وہاں موجود ہوں گے۔ سائیکل پر، ہپیل یا گھڑ سوار، اور ہمیشہ جڈوں
میں۔ دوسرے کم سفر نہیں کرتے۔ گارڈیا سول موجودہ حکومت کی بساط پر ایسے
بٹرس ہیں جن کی مدد سے عوام کی سیاسی اور سماجی سرگرمیوں کو چیک کیا جاتا
ہے۔ اور اب پادری اپنا لبا چوغا سنبھالتا ہوا دو گھڑ سواروں کے آگے آگے
تیز تیز چلتا ہوا ہماری جانب آ رہا تھا۔ ہسپانوی سوسائٹی کو استحکام بخشنے والے
دونگھبان..... پادری اور گارڈیا سول۔ جیپ کے قریب آ کر انھوں نے
لگا میں بھیجی ہیں جیپ کے اندر بیٹھے ہوئے مجھے صرف گھڑوں کی نتھوختیاں نظر
آ رہی تھیں۔ میں باہر آ گیا۔

"سینور ہم ٹو رہا میں رات بسر کرنا چاہتے ہیں" میں نے جھکتے ہوئے کہا
"کیا آپ ہیں یہاں کے یوتھ ہوسٹل کا پتہ بتا سکتے ہیں؟"
"قومیت؟" گارڈیا سول نے میرے سوال کو نظر انداز کرتے ہوئے
کر خنکی سے پوچھا۔

"پاکستانی" میں نے فوراً جواب دیا۔
"انگریز" ٹونی نے اپنی بارش تھوختی جیپ سے باہر نکال کر کہا۔
"منزل؟" دوسرے گارڈیا سول نے اپنے گھوٹے کو تھپکتے ہوئے دریافت کیا۔
"رہوڈیشیا" ٹونی نے بتایا۔
"سپین، فرانس، سوئٹزرلینڈ، آسٹریا....." میں نے ساتھ ساتھ انگریزوں
پر گنتی شروع کر دی۔
"ٹھیک ہے۔ ٹھیک ہے....." گارڈیا سول نے بے صبری سے

”اتنی جدید عمارت آسیب زدہ نہیں ہو سکتی“ ٹونی فرش پرچھے نرم قالین پر لیٹ گیا۔ ”ہو گیا ناچھوٹا سا لطیف؟“

”مٹھان“ میں نے اُسے چھڑا۔ وہ ہونہو کرنے لگا۔

”باہر کا دروازہ کھلا ہے۔ فرنیچر بھی موجود ہے۔۔۔۔۔ لیکن۔۔۔۔۔ نہیں ابھی اتنا ہی کہ پایا تھا کہ کہیں دودر قدموں کی چاپ سنائی دی۔ بے حد مدہم مگر نیسے تھے قدموں کی چاپ۔ میں بڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ ٹونی نے فوراً ہونہو بند کر دی اور داڑھی کھٹکا کر قالین سے اٹھ کھڑا ہوا۔ ہمارے کان قدموں کی چاپ پر لگے تھے اور آنکھیں کاؤنٹر کے ساتھ والی میزھیروں پر کیونکہ آواز اُدھر سے ہی آرہی تھی۔ خاصی دیر بعد میزھیروں پر ایک ٹنگنا سا بوڑھا نمودار ہوا۔ اُس کی جھکی ہوئی کمر کے گرد بندھی ہوئی بلیٹ کے ساتھ چابیوں کا ایک دزنی گھٹا لٹک رہا تھا۔ شاید وہ اس عمارت کا رکھوالا تھا۔

”سینور! ٹونی نے ہکلاتے ہوئے کہا ”ہم غلطی سے یہاں آگئے ہیں ہم تو یوتھ ہوسٹل۔۔۔۔۔“

”مومنٹو“ بڑھے نے ہم دونوں کی دھول میں اُٹی ہوئی صورتوں اور میلی جیکٹ نیپروں پر ایک نگاہ ڈالی اور بڑے اطمینان سے آہستہ آہستہ چٹا ہوا دروازہ کھول کر باہر نکل گیا۔

”مومنٹو یعنی ایک لمحہ خاصا طویل ثابت ہوا۔ آخر کار صدر دروازہ کھلا۔ پہلے وہ چابیوں والا بوڑھا داخل ہوا اور اس کے پیچھے ایک پتہ قد غلامی آنکھوں والی نوبلہ لڑکی ٹھکنی چل آئی۔ ٹونی کی تو باپیں کھل گئیں۔

”سبیلو“ اس نے اپنا ہاتھ نیکر کے ساتھ رگڑ کر صاف کیا اور مصافحہ کرنے کی خاطر آگے بڑھایا۔

”سینور؟“ لڑکی نے ٹونی کا بڑھا ہوا ہاتھ نظر انداز کرتے ہوئے میری طرف

سوالیہ نگاہوں سے دیکھا۔

”تورنٹیکو۔ یوتھ ہوسٹل“ میں نے سمجھانے کی کوشش کی۔

”آپ درست جگہ پر آئے ہیں“ اس نے بغل میں سے ایک رجسٹر نکال کر کاؤنٹر پر رکھ دیا اور نہایت شستہ انگریزی میں ہم سے مخاطب ہوئی ”آپ کے کاؤنٹر؟“ ”اوہ کاؤنٹر؟“ ہم دونوں نے کورس میں جواب دیا ہمارے کارڈ بقیہ سامان کے ساتھ جیب میں رکھے تھے۔

”مومنٹو“ میں نے لڑکی سے کہا۔

”مومنٹو“ ٹونی تو کمر تک جھک گیا۔

”ہم دونوں باہر آئے تو ٹونی کہنے لگا ”ذرا مجھے سونگھنا“

”کیا مطلب؟“ میں نے حیران ہو کر کہا۔

”بس ذرا سونگھ کر بتانا کہ کیا اب بھی میرے جسم سے گوشت کی بو آتی ہے جو اس لڑکی نے میرے ساتھ ہاتھ ملانے سے گریز کیا ہے؟“

”کم از کم گوشت کی بو تو نہیں آتی“ میں نے ہنس کر کہا ”ویسے ہسپانہ میں مردوں سے ہاتھ ملانے کا رواج نہیں ہے“

”اس کا مطلب ہے پھر کوشش کی جائے“ اُس نے خوش ہو کر کہا۔

”کوشش کرنے سے پیشتر کسی آئینے میں صورت دیکھ لینا۔ اس بے ہنگم داڑھی میں بالکل چھوٹے سے لطیفے لگتے ہو“

”مٹھان“ ٹونی نے دانت نکال دیئے۔

کارڈ تلاش کر کے ہم بھاگ بھاگ واپس ہال میں پہنچے۔ بوڑھا چوکیدار ہال کے مختلف کونوں میں رکھے لمبے جلا رہا تھا اور لڑکی سر جھکائے رجسٹر پر کچھ لکھ رہی تھی۔

”کارڈ؟“ ہم دونوں نے اپنے یوتھ ہوسٹل کارڈ میز پر رکھتے ہوئے کہا۔

اس نے رجسٹر پر اندراج کر کے کارڈوں پر مہر لگائی اور گردن میزھیروں کے کہنے

گئی تیسری منزل پر کسی بھی کمرے میں سو جائیے؟
 "اور آپ؟" ٹونی نے کمال محبت سے دریافت کیا۔
 "میرے بچے میرا انتظار کر رہے نہیں گے" لڑکی نے خوش دلی سے جواب دیا۔
 ٹونی کا چہرہ ٹٹک گیا۔

"کیا اس..... یوتھ ہوٹل میں ہمارے علاوہ کوئی اور سیاح مقیم نہیں؟ میں نے دریافت کیا۔

میں کمرے سے باہر آیا اور تیزی سے چلتا ہوا راہداری کے آخر تک آگیا جہاں میٹھیوں کے پاس ٹونی حلق چھاڑ پھاڑ کر ہڑے ہڑے کے نعرے لگا رہا تھا۔
 "اے اوہپ اوہپ ہپ ہڑے کے بچے" میں نے غصے سے کہا۔ خدا کے لیے اس دیران عمارت میں یوں نہ چیخو۔ مجھے پہلے ہی خوف آرہا ہے..... پیٹ میں درد ہے کیا؟"

"نہیں اُس نے مسکرا کر کہا۔ دراصل یہ عمارت حال میں ہی طب کے طالب علموں کی رہائش کے لیے تعمیر کی گئی۔ گرمیوں کی چٹھوں کے دوران میں جب طالب علم اپنے آبائی شہروں اور قصبوں کو لوٹ جاتے ہیں تو اسے سیاحوں کے لیے مخصوص کر دیا جاتا ہے۔ ویسے بھی ٹوریا جیسے دور افتادہ شہر میں کبھی کبھار ہی کسی سیاح کا گزر ہوتا ہے۔ ایک مرتبہ تو کمال ہو گیا۔....."

"اے مولان دیکھو تو سہی" اس نے میرے کندھے پر زور سے دھپ لگائی اور ہاتھ پکڑ کر ساتھ والے کمرے میں لے گیا۔ یہ ایک اجتماعی غسل خانہ تھا۔ نہانے کے شاور زودو چار نہیں۔ درجنوں! گرم پانی۔ ٹھنڈا پانی۔ گرم..... وہ غسل خانے کے ایک سرے سے شروع ہوا اور گرم پانی ٹھنڈا پانی کی گردان کرتا ہوا شاور زکوٹا چلا گیا۔ گرم پانی سے اٹھنے والی بجاپ نے پورے غسل خانے کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔

"آپ کے بچے انتظار کر رہے ہیں گے" ٹونی نے جھائی لیتے ہوئے کہا۔
 "اور غاند بھی" لڑکی نے شرارت سے کہا۔ "بہر حال آپ صبح اپنے کارڈ کارڈس سے وصول کر لیجئے گا میں نہ آسکوں گی۔ شب بخیر"

"ہڑے" میں نے بھی نعرہ لگایا اور گرم پانی کی اس بارش سے لطف اندوز ہونے کی خاطر میدان میں کود پڑا۔ ایک گرد آلود اور گرم دن کی طویل مسافت کے اختتام پر اتنے وسیع پیمانے پر نلکین غنیمت غیر مترقبہ سے کسی طور کم نہ تھا۔ ہم خاموشی تک نئے بچوں کی مانند شور مچاتے ہوئے ٹوکر تے وہاں نہاتے رہے۔

اُس نے رجسٹر بغل میں دایا اور دروازہ کھول کر اُسی طرح ٹھکتی ہوئی باہر نکل گئی۔ بوڑھا کارڈس وہیں ایک صوفے پر بیٹھ کر سگریٹ پینے لگا۔ ہم دونوں باہر آئے۔ جیپ میں سے ضروری سامان نکالا اور پھر اسے پورچ میں کھڑا کر کے تیسری منزل پر پہلے آئے۔ یہاں درجنوں کمروں میں سے ایک اپنی شب بیری کے لیے منتخب کیا اور اپنے سیلینگ بیگ کھول کر بستروں پر بچھا دیئے۔ ٹونی عمارت کا تفصیلی جائزہ لینے کی خاطر کمرے سے باہر چلا گیا۔

اس غسل خانہ سے فارغ ہو کر ہم واپس کمرے میں آگئے۔ قشالہ کی دھول اور گرمی سے نجات پانے کے بعد اب میں بے حد تروتازہ اور ہلکا پھلکا محسوس کر رہا تھا۔ ٹونی نے ایک بیگ میں سے ہنڑ بیٹ کا ایک چھوٹا سا پھاڑا برآمد کیا۔ اپنی پیشہ ورانہ عمارت کو بردے کا لاتے ہوئے ایک انتہائی باریک

میں بستر پر بیٹھ کر سوچنے لگا کہ آج صرف ایک دن میں میں نے ہسپانیہ کے کتنے رُودپ دیکھ ڈالے۔ صبح میں سان ساستیان میں تھا۔ بارش اور دُھند۔ پھر

قسم کا لباس تو پہن لو۔

ٹونی نے میری اس درخواست پر اپنی براؤن نیسکر کے ساتھ ایک بوسیدہ کالی بنیان بھی پہن لی۔ سر کے بالوں اور داڑھی کو انگلیوں سے سنوڑا اور اٹھ کھڑا ہوا۔ "خوش پوشاکی ہمیشہ سے میری شخصیت کا ایک لازمی جزو رہی ہے۔" اُس نے اپنی بنیان کے ایک سوراخ میں انگلی چلاتے ہوئے نہایت سنجیدگی سے اعلان کیا۔ میں نے ٹونی کی خوش پوشاکی سے متاثر ہو کر اُسے اُس حبشی کے باسے میں بتایا جو لنڈن کی کسی گلی میں تنگ و مضطرب گھوم رہا تھا۔ ایک انگریز بڑھیا نے اسے اس حالت میں دیکھا تو ڈانٹ کر کہنے لگی "نوجوان لڑکے فہیں شرم آنی چاہیے جاؤ کوئی مناسب قسم کا لباس زیب تن کر کے آؤ۔" حبشی نے نہایت برغور داری سے سر ہلایا اور چلا گیا۔ تھوڑی دیر بعد وہ واپس آیا تو اس نے اپنے گلے میں ایک نہایت نفیس قسم کی ٹائی باندھ رکھی تھی۔ صرف ٹائی.....! ٹونی بدستور اپنی بنیان کے سوراخ میں بڑی سنجیدگی سے انگلی گھماتا رہا اور پھر شراب کا خالی مشکیزہ بغل میں داب کر کرے سے باہر نکل گیا۔ اُسے شاید میرا چھوٹا سا لطیفہ بالکل پسند نہیں آیا تھا۔

ٹو ریا! — دو پہاڑوں کے درمیان اور نیلے آسمان تلے پھیلا ہوا ایک سونا جاگتا شہر جو اپنے گرد و فواح کے جزائیاتی خدوخال میں کچھ ایسے عجیب لپس گیا ہے جیسے اس کے سرخ پھتوں والے مکان تنگ گلیاں اور بازار انسانی ہاتھوں کے تعمیر کردہ نہیں بلکہ زمین میں سے خود بخود اُگ ائے ہیں۔ پھوٹ پڑے ہیں! دریا تھے دو پرواسے ایک کمان کی مانند آغوش میں لیے ہوئے ہے۔ ٹو ریا "سان جوآن دے دارو" کی مشہور خانقاہ کے پہلو میں سے شروع ہوتا ہے اور پھر پالمیر اور سیاحہ اوک کے جھنڈوں میں سے جھانکتا دریائے حدہ کو عبور کر کے قدیم قلعے کے گرد تنگ و تاریک گلیوں میں گم ہو جاتا ہے اس شہر

ٹکڑا کاٹا اور میری جانب بڑھا دیا۔ میں نے گوشت کا ٹکڑا ایک کونے سے پکڑ کر اپنی ناک کے آگے لہرایا۔ اس میں سے ٹونٹن مارکٹ میں واقع بڑے گوشت کی دکانوں میں سے آنے والی ناگوار بو بدرجہ اتم اٹھ رہی تھی۔ قشتالیہ کا گرم موسم اس پر پوری طرح اثر انداز ہو چکا تھا۔

"ٹونی ڈبیر..... یہ ہنر بیف افریقہ جا کر کسی مگر مچھ کو کھلا دینا۔ اس میں سے بو آرہی ہے۔"

"بو؟" اس نے گوشت کو اک عالم وافتگی میں لیے سونگھا جیسے وہ بڑے ہونے بیف کے ٹکڑے کی بجائے رُباعیات نامی مکتا ہوا گلاب ہو اور پھر لورا منہ کھول کر اپنے دانت اُس میں گاڑ دے۔ "مجھے تو نہیں آرہی" اس کے جبرے انجن کے پسٹن کی مانند تیزی سے حرکت کرنے لگے۔

"ابھی نہیں سکتی" میں نے ناک ٹیکر کر کہا۔ بہر حال میں تو مشہر جا کر صاف ستھری اور بھرپور قسم کی خوراک کھانے کے موڈ میں ہوں۔ تین چار پاؤنڈ ہنر بیف نگھنے کے بعد ٹونی نے ایک مرتبہ پھر "ہرے" کا نعرہ بلند کر دیا۔

"اب کیا ہوا ہے؟" میں نے کپڑے بدلتے ہوئے دریافت کیا۔ "آرہی ہے۔" باقی ماندہ گوشت پر ناک جھاتے ہوئے اُس نے فیصلہ دے دیا۔ "میں بھی تمہارے ہمراہ شہر جاؤں گا اور پھر بڑی احتیاط سے بقیہ بیف کو اپنے بیگ میں واپس رکھ لیا۔

"اور یہ گوشت کس سلسلے میں محفوظ کیا جا رہا ہے؟" "افریقہ کے مگر مچھوں کے لیے....." اُس نے منہ کھول کر ایک زوردار تشعیر داغ دیا۔ "ہو گیا نا ایک چھوٹا سا لطیفہ؟" "ہو گیا" میں نے مسکرا کر کہا۔ کم از کم باہر جانے سے پشت پر کوئی مناسب

کی خوبصورتی نے اشبیلیہ کے حُسن پرست شاعر انتونیو مچادو کو بھی اپنا گرویدہ کر لیا تھا۔ مچادو نے قشتالیہ کے صوبے کو بدبخت کہا، مگر اسی صوبے کے ایک شہر نے اُسے اپنے حُسن میں ڈبو کر اس بدبختی کو خوبصورتی میں بدل دیا۔ وہ لکھتا ہے،

”خوبصورت اور پاکیزہ ثوریا۔ نبشتی پہاڑیوں کے درمیان

میں آج ایک مرتبہ پھر
تیری فِصیل کے پہلو میں دریاٹے حد رہ کے کنارے
پاپلر کے سنہری درخت دیکھ رہا ہوں۔

ثوریا سحر زدہ

ثوریا تیغ کر لینے والا“

دریاٹے حد رہ کے کنارے پاپلر کے درختوں کے درمیان لیٹی ہوئی پُر سکون مڑک مچادو کی پسندیدہ میرگاہ تھی۔ آج شام جب ہم ثوریا میں داخل ہوئے تو مجھے معلوم ہوا تھا کہ وہ چھوٹی سی ندی جسے ہم نے عبور کیا تھا تاریخی دریاٹے دوبرو تھا۔ ساڑھے چھ ہزار فٹ بلند اربیان کی پہاڑیوں پر پھیلے ہوئے پائن اور بیج کے جنگل میں سے جنم لے کر یہ دریا ثوریا کو آچھوتا ہے اور پھر بڑی خاموشی سے پورے ہسپانیہ کے سینے پر بہتا ہوا پرتگال میں داخل ہو جاتا ہے۔ ثوریا بھی ایک زمانے میں ہسپانیہ کے دوسرے تمام شہروں کی طرح مسلمانوں کے زیرِ نگیں تھا۔ ہسپانوی تاریخ دان روایتی تعصب کی بنا پر ہیں تو یہ بتاتے ہیں کہ یہ شہر ارکان کے بادشاہ الفاسو نے مسلمانوں سے دوبارہ حاصل کیا مگر مسلمان یہاں کب قابض ہوئے اس کے بارے میں مُہربان ہیں۔ مجھے خود ثوریا میں اسلامی دور کے بارے میں کسی اسلامی تاریخ میں کوئی قابل ذکر حوالہ نظر نہیں آیا۔

یوتھ ہوسٹل سے باہر نکل کر ٹونی اور میں ”الامیڈا دی سروانت“ کے ہرے جبرے

پارک کے پہلو میں سے نکلتی ہوئی ایک سڑک پاسو سان فرانسکو پر جو لے۔
ثوریا میں اشتہاروں کی تیز روشنیوں، ٹریفک کے بے پناہ شور اور جدید زندگی کی دوسری قباحتوں سے پاک قشتالیہ کے بے آب و گیاہ پہاڑوں میں ہم ایک خاموش گھر پر وقار بستی سے۔ زندگی سے بھرپور۔ مگر زندگی کی یہ لہر سطحی ہونے کی بجائے اس شہر کے قدیم درو دیوار اور اس کے باسیوں کے اندر چپکے چپکے اُبلتی رہتی ہے۔

ٹونی شاید ابھی تک مجھ سے ناراض تھا۔ وہ نیکر کی جیبوں میں ہاتھ ٹھونسنے جب آئرش آنکھیں مسکراتی ہیں، گنگنا تا چلا جا رہا تھا۔ مرکزی چوک عبور کر کے ہم کالنے سے کلاڈو کی چوڑی سڑک پر آگئے جو نسبتاً پُر رونق تھی ہم ایک قموہ خانے کے پاس سے گزر رہے تھے کہ ٹونی اس کے باہر دیوار پر لگا ایک بُل غاسٹ کا اشتہار دیکھ کر رُک گیا۔

”بھوں“ اس نے میری طرف دیکھ کر آنکھیں گھمائیں اور پھر اشتہار پر چھٹی بُل کی تصویر سے مخاطب ہو کر سنایت سنجیدگی سے کہنے لگا۔ ”تو جوان بُل متھیں شرم آنی چاہیے۔ جاؤ کوئی مناسب قسم کا لباس زیب تن کر کے آؤ“ اس کے ساتھ ہی اس کے وسیع و سرخس ڈیل ڈول میں سے ایک زوردار قموہ برآمد ہو گیا۔ قموہ خانے کے باہر بیٹھے ہوئے چند بوڑھے ہماری جانب بڑی دلچسپی سے دیکھنے لگے۔

”اور ذرا تصور کرو اگر یہ بُل ایک نفیس قسم کی ٹائی باندھ کر آجائے تو صرف ٹائی.....“ وہ ہنستے ہنستے بے حال ہو رہا تھا۔
”ٹونی! میں نے بزرگوں کی مانند ڈاٹا۔“

”سوری“ اس نے فوراً ہتھیار ڈال دیے اور نیکر کی جیبوں میں ہاتھ ڈال کر ایک مرتبہ پھر ”جب آئرش آنکھیں.....“ گنگنا تا ہوا چلنے لگا حساب

مسکراہٹ میں بچوں کی سی معصومیت تھی۔

”گراسیا!“ میں نے پانچ پستیے کا ایک نوٹ جیب میں سے نکال کر بڑھیا کے ریشہ زدہ ہاتھوں میں تھما دیا۔ ہسپانوی چیبلی کے ان پھولوں میں ایک بانی پہچانی نہ تھی۔ گرم اور مشرقی!

ہم نے لگی کے اندر جھانکا۔ نیم تاریک اور بے حد تنگ! دونوں طرف بنے ہوئے مکانوں کے چھتے ایک دوسرے کو چھو رہے تھے۔ بائیں ہاتھ پر لوہے کی سائخ سے ایک زنگ آؤد بورڈ لٹک رہا تھا۔ ”آل گرینچو“ ہم دروازہ کھول کر اندر چلے گئے۔

یہ ایک قدیم طرز کا انتہائی پرسکون اور دیدہ زیب شراب خانہ تھا۔ کثرت استعمال سے اگرچہ قریب کے چمڑے سے بنے ہوئے صوفوں کا رنگ ماند پڑ چکا تھا مگر ان میں ایک کلاسیکی قسم کی جاذبیت بدستور قائم تھی۔ دیواروں کا پلستر سیاہی مائل تھا۔ بلند چھت کے سیاہ شہتیروں میں لوہے کے بڑے بڑے کندے پیوست تھے جن کے ساتھ سالم جانوروں کے دھڑلک رہے تھے۔ مشرقی گرم سالوں سے محفوظ کردہ سوکھا ہوا گوشت۔ سوربوع اپنی کریمہ النظر لمبی تنور تھینوں کے پڑے بکرے، گائے کے گوشت کے بڑے بڑے ٹکڑے۔ ان جانوروں کے گوشت کا رنگ شراب خانے کی بقیہ آرائش کی مانند سیاہی مائل تختار چھت کا جانب دیکھنے سے کچھ اس قسم کا تاثر ابھرتا تھا جیسے مردہ جانوروں کا یہ ریوڑ آپ پر حملہ آور ہونے کو ہے۔ جانے انہیں کتنے برس پیشتر کھا کر یہاں لٹکایا گیا تھا۔ جب کبھی کوئی گاہک فرمائش کرتا تو شراب خانے کا پستہ قد مالک ایک میٹھی شہتیر کے ساتھ لگا کر ٹھیری سے پسندیدہ جانور کے جسم کا مطلوبہ حصہ کاٹ کر لے آتا۔ یہ گوشت سلاڈ اور ڈبل روٹی کے ساتھ پیش کیا جاتا۔ کانٹر کے عقب میں شیفت پر لکڑی کے درجنوں ڈرم دھڑاتے تھے جن پر ہسپانیہ کے مختلف

برابر ہر چکا تھا۔

کالٹے سے کلاڈو کے دونوں طرف ثوریا کے باسی قومہ خانوں کے باہرٹ پاتھ پر لگی کرسیوں پر بیٹھے رات کے کھانے سے پیشتر مختلف مشروبات سے موٹھے گرم کر رہے تھے۔ الیہ اور فرانس کی طرح ہسپانیہ میں بھی رات کا کھانا گھر کی بجائے باہر قومہ خانوں میں کھانے کا رواج عام ہے۔ کھانے کے اوقات دس بجے سے شروع ہوتے ہیں۔ اس سے پہلے اگر کسی قومہ خانے میں جا کر کھانے کے بارے میں دریافت کریں تو آپ کو خبیثی سمجھا جائے گا۔ رات کے اس پھرٹک پر ٹریفک بالکل بند تھی۔ چند نوجوان لڑکے اور لڑکیاں شرک پر ادھر ادھر گھوم رہے تھے۔ فٹ پاتھ کا جو حصہ قومہ خانوں کی کرسیوں سے خالی تھا وہاں نیچے تین بیٹیوں کی سائیکوں پر سوار میٹر حضرات کی ٹانگوں کو نشاء مشق بنارہے تھے۔ ہم پاس سے گزرتے تو وہ بطور خاص ٹوٹی کو دیکھ کر بے حد محفوظ ہوتے اور گھنٹیاں بجاتے۔ ایک پرجوش قومہ خانے کے باہر دو موٹی تازی فراخ دہن دو شیرائیں ٹوٹی کو دیکھتے ہی نہایت جلد سے طریقے سے ہنسنے لگیں۔ اس کا بھاری کن ٹوش وہیں جا بد ہو گیا۔ ”بس یہیں بیٹھ جاتے ہیں“

”یہاں شور بہت ہے، کسی پرسکون جگہ بیٹھا جائے، ہمیں نے ٹکے لپیڑ جواب دیا۔

”موتھان ٹوٹی نے مجھلا کر کہا اور پھر چلنے لگا۔

”خاسمین۔ خاسمین! ایک بڑی عورت کی کے ٹکڑ پر کھڑی چیبلی کے پھول بیچ رہی تھی۔ ہسپانیہ کی اکثر عمر رسیدہ عورتوں کی مانند اس نے سر کو ایک کالے رومال سے ڈھانپ رکھا تھا اور گھٹنوں تک لمبے سیاہ لباس میں ملبوس تھی۔ ہم قریب سے گزرتے تو اس نے بڑی مشکل سے جھک کر آگے رکھی ٹوکری میں سے چیبلی کا ایک گجر اٹھایا اور میری جانب بڑھا دیا۔ خاسمین سینیور؟“ اس کی پوچھی

صوبوں میں کشیدگی جانے والی انگوڑی شرابوں کے نام کندہ تھے۔ کاتالونیا صوبے کی لاسالو۔ آراگان کی بوریا۔ گلیسیا کی ربرو۔ نوارا کی میوڈلا۔ مرسیا کی جمیلہ اور پھر اندلس کی منزانیلا۔ یونیتلا اور شیریں وغیرہ۔ ہر ڈوم کے پینڈے کے قریب ایک ٹونٹی لگی تھی، جسے گھما کر گم میں شراب بھری جاتی۔ ہسپانیہ کے اکثر شراب خانوں کی طرح یہ جگہ بھی بے حد پر سکون تھی۔ لائبنوں کی مدد سے روشنی میں چند خوش لباس بوڑھے اور عورتیں صوفوں پر براجمان شراب نوشی میں مشغول تھے۔ حسب معمول ان کے بچے بھی ہمراہ تھے جن کے لیے دودھ کا انتظام کیا گیا تھا۔

”لاکومیدا سنیور“ ٹونی نے کاؤنٹر پر جا کر مالک سے کھانے کے بارے میں استفسار کیا جو اس وقت ایک ڈرم کی ٹونٹی چمکانے میں مصروف تھا۔

”ہی سنیور! اسس نے سر ہلایا اور کاؤنٹر کے پیچھے سے نکل کر ہمیں شراب خانے کے کونے میں واقع ایک تنگ دروازے کے پاس لے گیا۔

”لاکومیدا“ اس نے سال خوردہ کوڑی کی درجن بھر سیڑھیوں کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا جو دوسری منزل تک جا رہی تھیں۔

سیڑھیاں ملے کر کے ہم اوپر پہنچے تو اپنے آپ کو کسی ہوٹل کے ڈرائنگ روم کی بجائے سیدھے سادھے گھوٹو قسم کے کمرے میں پایا جس کے وسط میں ایک میز کے کمرے درمیان میں ایک ہسپانوی، اس کی پستہ قد بیوی اور گول مٹول لڑکا بیٹھے شاید سہارے ہی راہ تک رہے تھے۔ ہمیں دیکھتے ہی وہ میزوں اٹھ کھڑے ہوئے اور بڑی گرمجوشی سے ہاتھ دایا۔ ٹونی نے ایک مرتبہ پھر ”لاکومیدا“ والا دعا پیٹ پر ہاتھ پیر کر بیان کیا۔ مرد نے بڑی مستندی سے میز اور دو کرسیاں کمرے کے باہر بالکونی پر لگا دیں اور کمرے تک جھک کر تقریباً کورٹس بجالایا۔ تشریف رکھیے سنیور!“

یہ بالکونی ایک چھوٹے سے پُر رونق چوک کی جانب کھلتی تھی جس کے درمیان

میں نصب قدیم وضع کے ایک کھجے کے لائین ٹاشیڈ میں سے ہلکی ہلکی روشنی پھوٹ رہی تھی۔ کھجوں کے دو درخت سہاری بالکونی کے پہلو میں سے اُٹھ کر ارد گرد کے مکانوں کی چھتوں سے بھی اُپر نکل گئے تھے۔ بے شمار لوگ کرسیوں پر بیٹھے خوش گپیوں میں مصروف تھے۔ ایک چھوٹا سا لڑکا زمین پر آلتی پالتی ماسے ایک موٹے بوڑھے کے بوٹ پالش کر رہا تھا۔ برش چلاتے چلاتے وہ لمحہ بھر کے لیے ”کٹا“ ادا لے گا ایک زوردار لغزہ بلند کرنا اور پھر سر ہلاتا ہوا پالش کرنے میں مگن ہو جاتا۔ چند نوجوان سامنے کے مکان کی دیوار پر چسپاں بل ٹاشٹ کے پوسٹروں کے سامنے کھڑے بڑے زور شور سے کسی گزشتہ بل ٹاشٹ کے بارے میں بحث کر رہے تھے۔ اسی دیوار کے ساتھ ٹیک لگائے ایک ہسپانوی عورت بڑے اطمینان سے اپنے بچے کو دودھ بھی پلا رہی تھی اور بل ٹاشٹ والی بحث میں بھی حسب مقدمہ حصہ لے رہی تھی۔ اس جھوم سے الگ تھلک روشنی کے کھجے کے نیچے دو نوجوان سر جھکائے گتار پر کرنی اُداس اور سست رو دھن پیڑ رہے تھے۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے یہ چھوٹا سا چوک اپنی ذات میں بالکل مکمل ہے۔ روشنی کا ایک قدیم کیمبا کھجور کے دو درخت بل ٹاشٹ کے پوسٹر، دو نوجوان موسیقار اور اس میں موجود لوگ اپنی اس مختصر دنیا سے اتنے مطمئن کہ انہیں نظری اٹھا کر سہاری جانب دیکھنا بھی گوارا نہیں۔

”مینو تورستیکا سنیور!“ تہرہ خانے کے مالک کے لڑکے نے ہسپانوی حکومت کی جانب سے خصوصی طور پر غیر ملکی سیاحوں کے لیے منظور شدہ کھانے کی فرسٹ کلاس آگے رکھ دی۔

”مینو تورستیکا“ میں درج شدہ کھانے روایتی ہونے کے علاوہ ارزاں بھی ہوتے ہیں۔ چالیس پینتے یعنی تقریباً چھ روپے میں سوپ کا پیالہ، خوراک کی ایک پیٹ، سوپ ڈش، انگوڑوں کی سرخ شراب کا ایک گم اور کافی۔ ٹونی ٹوری کے

یہ بالکونی ایک چھوٹے سے پُر رونق چوک کی جانب کھلتی تھی جس کے درمیان

باشندوں کی مرغوب خوراک مجنا ہوا لیکر کھانا چاہتا تھا اور میں تندوریں دم بخت کی گھٹی ٹراوٹ مچھلی۔ سہاری پسند معلوم کرنے کے بعد دونوں میاں بیوی باورچی خانے میں جا کر کھانے کی تیاری میں مصروف ہو گئے اور ان کے لڑکے نے میز پر صاف تھرا کپڑا بچھا کر اس پر بڑے قرینے سے چھری کانٹے اور چینیوں کے پیلے سجا دیے۔ کھانے کی تیاری کے دوران میں ہم خستہ ڈبل روٹی پر ٹوریا کا مشہور اور مزے دار مکھن لگا کر کھاتے رہے اور اپنی جھوک چمکاتے رہے۔

پیلے کچے ٹماٹروں اور کالی مرچ سے بنا رشہ "گاڈ پاچو" نامی ٹھنڈا سوپ آیا۔ پھر ٹونی کے سرخ لیکڑے کا ورد ہوا جس کی لاتعداد تیلی تیلی ٹامغیں پیٹ سے باہر رینگ رہی تھیں۔ یوں گھٹا تھا ابھی چھلانگ لگا کر ٹونی کی داڑھی میں جا گئے گا۔ میری ٹراوٹ مچھلی بھی سالم خفی مگر کاشا جھونے سے چھوٹے چھوٹے خستہ ٹکڑوں میں بکھر گئی۔ کھانے کے بعد کافی آگئی اور ہم کرسیوں پر دراز ہو کر نیچے چوک میں بچنے والی گتاؤں کی موسیقی سے لطف اندوز ہونے لگے۔

نوجوان موسیقار پاپ موسیقی بجانے والوں کی مانند اپنی گتار کئے گاؤں کو بے جھ سے جھنجھوڑنے کی بجائے انہیں سنایت نرمی سے ہلکے ہلکے چھوڑے تھے۔ دھن قد سے شوخ ہوتی تو بھی چھپر چھاڑ میں پیار کا عنصر ہی غالب رہتا۔ "فلیمکو" کی روایتی دھن گتار پر بجانے کے علاوہ گائی بھی جاتی ہے۔ مالا گوسا اور فنڈ ٹوکس بھی اسی موسیقی کی شاخیں ہیں۔ اگرچہ یہ نوجوان صرف اپنی تفریح کی خاطر گتاریں بجا رہے تھے مگر جب کبھی ان کی دھن میں کوئی خصوصی نئے ابھرتی توجہ چوک میں بیٹھے لوگ نعرہ اٹھاتے "اولے اولے اولے بلند کر کے انہیں داد سے نوازتے، ہوا کے لطیف جھونکوں سے کھجور کے پتے آہستگی سے حرکت کرتے اور ان کے متحرک سائے بے فکر بوڑھوں اور زندہ دل نوجوانوں کے چہروں پر کھیلنے لگتے۔

نصف شب کے قریب چوک خالی ہونا شروع ہو گیا۔ نوجوان موسیقاروں

میں سے ایک نے کلائی پر بندھی گھڑی پر ایک نظر ڈالی اور پھر چپکے سے اپنے ساتھی کے کان میں کچھ کہا۔ دونوں مسکرائے اور پھر گتاریں کاندھوں پر ڈال کر چوک سے باہر شرک کی جانب چل دیئے۔

"شراب نہایت عمدہ تھی؟ ٹونی نے تقریباً اوجھتے ہوئے کہا۔ "یار ایک سگریٹ تو بلاؤ۔"

"باہر چل کر پیتے ہیں" میں نے میز پر سے جمبیلی کا گجر اٹھائے ہوئے کہا۔ اپنے اپنے حصے کا بل ادا کرنے کے بعد ہم سیڑھیاں اتر کر نیچے شراب خانے میں آ گئے۔

"موتیلا" ٹونی نے اپنا بچکا ہوا مشکیزہ کاؤنٹر پر رکھ کر اپنی پسندیدہ شراب کے ڈرم کی جانب اشارہ کیا۔ مالک نے مشکیزے کا مزہ ٹونٹی پر کسا اور پھر اسے لبالب بھر کر ٹونی کے حوالے کر دیا۔ "سچا سچ پیتے۔" قیمت ادا کرنے کے بعد اس نے مشکیزے کا غمار اُور بوجھ کاندھے پر لاد ادا اور ہم دونوں شراب خانے سے باہر آ گئے۔ گلی کے نچر پر جمبیلی کے گجر سے بیچنے والی بڑھیا اب سر جھکائے اپنی تھیلی پر پھیلے سکتے گھنے میں مصروف تھی۔ چھوڑوں کی نوکری خالی ہو چکی تھی۔ ہم گلی سے نکل کر ایک مرتبہ کالے سے کلاؤ کی بڑی شرک پر آ گئے۔

"کوالسٹ" ٹونی کا چہرہ یوں متغیر ہوا جیسے اُسے مرگی کا دورہ پڑنے والا ہو۔ "بائی سٹنسر" اس نے چیخ کر کہا۔ "بھئی لڑکیاں! اٹھتے دے!"

ٹونی درست کر رہا تھا۔ ہم لاتعداد ادویہ کے ترغے میں تھے۔ ہمارے چار سو کالے سے کلاؤ کی شرک پر لڑکیوں کا ایک ہجوم خراماں خراماں شاید معطر معطر بھی چلا جا رہا تھا۔

"ہے تورو" ایک سستہ قدم پانوی لڑکی نے ٹونی کی کمر میں اپنے نیچے کی ڈنڈی کھوپتے ہوئے غصے سے کہا۔ "شرم نہیں آتی پاسو کے آداب کی خلاف ورزی

مشرک پر پاسبیو میں دونوں فریق ہرجیت سے بے نیاز صرف گناہوں کے لیے
ہی حصہ لیتے ہیں۔ پاسبیو کی رسم کا آغاز عربوں کے زمانے میں ہوا، اور اسی لیے
آج بھی اس میں مشرقی حجاب کی خوشبو ہے۔ ہسپانیہ کے صوبے کی
عورتیں اسی مشرقی جس کی بنا پر اپنا چہرہ رد مال سے ٹھکانپ کر گھر سے باہر نکلتی ہیں
سیکڑوں برس گزرنے کے باوجود وہ اپنے عرب ماسنی کی ایک روایت کو زندہ
رکھے ہوئے ہیں۔ وہ پردہ کرتی ہیں۔

ہسپانیہ میں شادی کے رسم و رواج کچھ کچھ ہمارے ملک کے ساتھ لگا کھاتے
ہیں شادی سے پیشتر آزادانہ میل ملاپ گناہ کبیرہ سمجھا جاتا ہے۔ بہر حال اگر والدین
کی رضا شامل ہو تو ایک مختصر سی کورٹ شپ کی اجازت مل جاتی ہے جو ایک
طے شدہ پروگرام کے مطابق سر انجام پاتی ہے۔ مثلاً لڑکا کلیسا میں عبادت کرتے
وقت لاٹ پادری کا تم سب لیوے کی بھیڑ میں ہو گا والا وعظ سننے کی بجائے
اپنی پسندیدہ لڑکی کو گھور سکتا ہے۔ محبوبہ کی بالکونی کے نیچے سے گزر رہا تو ایک
آدھ آہ بھرنے پر بھی کوئی پابندی نہیں۔ نوجوان اگر شادی پر مائل ہو تو سینا جانے
کی اجازت بھی مل سکتی ہے۔ شو کے دوران وہ رواج کے مطابق اپنی محبوبہ کا ہاتھ
پوسے تین منٹ کے لیے تمام سکتا ہے۔ میرے خیال میں اگر تین منٹ سے زیادہ
کا عرصہ ہو جائے تو لڑکی اُسے اپنی بے عزتی سمجھتی ہو گی اور اپنا ہاتھ نہیں چھڑاتی ہو گی۔
ان کٹھن رومانی مرحلوں کے درمیان چند تعینہ عشقیہ تغاریر بھی ہوتی ہیں جو صدیوں
سے کسی رد و بدل کے بغیر رائج ہیں۔ ان میں ذرہ بھر تحریف لڑکے کو عمر بھر کوڑا
دکھنے کے لیے کافی ہے۔ مثلاً وہ جذباتی ہو کر یہ تو کہہ سکتا ہے کہ "کنول کے پھول
مجھے بے حد اچھے لگتے ہیں اور آپ بھی....." لیکن اگر وہ بلا تکلف "ہائے تم مجھے
بیاد رہتی ہو" پر اتر آئے تو کشیدگی بڑھنے کا امکان ہوتا ہے۔ ہسپانیہ میں اگر
آپ کسی لڑکی کو باہر لے جانا چاہیں (باہر لے جانے سے مراد سینا وغیرہ دکھانا)

کرتے ہوئے؟ دوسری جانب چلو۔ لڑکوں کے ساتھ!"
"شکر یہ سپورٹیا" ٹوٹی جھک کر آداب بجالایا۔ اگر میں "تورو" یعنی بل ہوں
تو کیا میں آپ پر حملہ آور ہو جاؤں؟

موٹی خاتون نے ہسپانوی میں جو کچھ بھی جواب دیا وہ ہماری سمجھ سے بالاتر
تھا۔ البتہ لہجے سے محسوس ہو گیا کہ "فٹے منہ" قسم کا لفظ ادا ہوا ہے۔
مشرک کے نصف حصے میں نوجوان لڑکیاں دو دو تین تین کی ٹولیوں میں
ہاتھ میں ہاتھ ڈالے بڑے طمطراق سے چل رہی تھیں۔ دوسری جانب لڑکوں
کے گروہ ردال دوال تھے۔ مگر ان کا رخ مخالف سمت میں تھا۔ مری کی مال دڈ
کی طرح یہاں بھی ٹریفک دو حصوں میں منقسم تھی۔ لڑکیاں دھیرے دھیرے
مشرک کے آغوش میں واقع چوک تک پہنچتیں اور پھر فوجی انداز میں ایک دم گھوم کر
واپس ہو جاتیں۔ اُدھر لڑکے بھی مشرک کے مخالف سرے پر پہنچ کر اباؤٹ ٹرن
ہو جاتے اور یہ پریڈ یو مینی باری رہتی۔ پریڈ یعنی پاسبیو۔

"شام کا پاسبیو" ہسپانیہ کی ایک خوبصورت اور رومانی رسم ہے جو اب
آہستہ آہستہ بڑے شہروں میں جدید زندگی کی گہا گہی سے خوف زدہ ہو کر ذرا
قبضوں اور چھوٹے شہروں میں سمٹ رہی ہے۔ پاسبیو کا لفظ بل فاسٹ کے آغاز
میں بل فاسٹ اور اس کے معاونین کی پریڈ کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ مگر شام کے
پاسبیو میں صرف پریڈ کی قدر مشترک ہوتی ہے۔ جہاں بل فاسٹ میں یہ مقابل کو زیر
کرنے کے لیے نیزے اور تلواریں کاٹ کام آتی ہے وہاں شام کے پاسبیو میں
جیتنے کے لیے حسن کی شونیاں بھرپور وار کرتی ہیں۔ اُدھر نیزے کی آنی جسم
میں پیوست ہو کر کام کرتی ہے اور اُدھر اس دیں میں جہاں چشمہ عزال عام ہے
اب بھی نگاہوں کے تیر ہی دل نشیں ہوتے ہیں۔ ایک میدان میں بل فاسٹ کا
مقرر لازمی جیت ہوتا ہے اور بل کی قسمت میں ہمیشہ سرنگوں ہونا اور اس

سے بھگا کر لے جانا ہرگز نہیں، تو آپ کو بہر حال مندرجہ بالا قوانین کی پابندی کرنا ہوگی۔ اگر نہیں کریں گے تو آپ کی اطلاع کے لیے عرض ہے کہ دنیا کا بہترین پتول لانا ہسپانیہ میں ہی بنتا ہے۔ دنیا کے اکثر ملکوں کی طرح بڑے شہروں میں رہنے والی بیبیاں خاصی آزاد خیال واقع ہوئی ہیں مگر دور افتادہ دیہات اور ثوریا بیبے چھوٹے شہروں میں ابھی تک ازمنہ وسطیٰ کی ذہنیت کا راج ہے۔ ایسی جگہوں پر میل لاپ کے لیے پاسیو کی رسم کا سہارا لیا جاتا ہے۔ ہفتے میں ایک شب اس کا ذخیرہ منجھ لینے کے لیے مخصوص کر دی جاتی ہے۔ رات کے کھانے سے فارغ ہو کر والدین قہور خانوں سے باہر فٹ پاتھ پر پچھی کر سیوں پر بیٹھ کر کافی یا شراب سے دل بہلاتے ہیں اور ان کے چہیتے اور چہیتیاں قسمت آزمائی کے لیے رٹک پر مٹر گشت شروع کر دیتے ہیں۔ بائیں جانب لڑکوں کے غول کھنڈل شام کے بہترین لباسوں میں کھڑے مسکراتے آنکھیں گھماتے چلے آ رہے ہیں اور دوسری طرف قصبے کی کنواری لڑکیاں آپس میں چہلیں کرتیں "آنکھیں بائیں کے فوجی اصول پر عمل پیرا لہک لہک کر چل رہی ہیں۔ پوری مخلوق میں سے ایک نہر وہیں کا آفتاب ہو رہا ہے۔ آپس میں مشورے ہو رہے ہیں۔ لیکن یہ نظارہ صرف دور دور سے کیا جاسکتا ہے، پاس آئیے گا تو کرسیوں پر براجمان خواتین کے والدین آپ کے خلاف ناؤل مے کر میدان سے باہر نکال دیں گے جیسینوں کی اس پریڈ میں اگر آپ کو کوئی خاتون بھلی لگے اور وہ بھی آپ کے قریب سے گزرتے وقت اک شان دلربائی سے بالوں میں لگا پھول اتار کر سونگھنا شروع کر دے تو پھر آپ پر لازم ہے کہ دوسری شب گتار کا ندھے پر ڈالے پھولوں کا گلدستہ ہاتھ میں تھامے ان محترمہ کی بالکونی تلے کھڑے ہو کر "موشے میو" قسم کا گانا گائیں لڑکی کو آپ کا گانا اور اس کے والدین کو آپ کا گلدستہ پسند آ جائے تو آپ کو گھر کے اندر بلا لیا جائے گا۔ ذریعہ معاش، تعلیم اور خاندان کے مکمل کوائف دریافت

کرنے کے بعد آپ کو مطلع کیا جائے گا کہ بر خور دار کل اپنی اماں کو سہا سے گھر بھیج دینا یا پھر دوسری صورت میں "خبردار جو آئندہ ہماری لڑکی کو....." وغیرہ۔ پاسیو کی ایک لطیف روایت یہ بھی ہے کہ قصبے کی تمام لڑکیاں رٹک پر ہونے والی پریڈ میں شریک نہیں ہوتیں بلکہ ان میں سے نسبتاً شرمیلی خواتین ارد گرد کے مکانات کی بالکونیوں پر سرج بن کر براجمان ہو جاتی ہیں۔ ان بالکونیوں کے آگے کسی ایک رنگ کا ریشمی کپڑا لٹکا دیا جاتا ہے۔ سلاخوں سے اسی رنگ کی دیدہ زیب جھنڈیاں اور فیتے بندھے ہوتے ہیں۔ پیدل چلنے والی خواتین تو اشادوں کنیوں میں اپنا مدعا بیان کر لیتی ہیں، یا پھر وہ سر میں لگا چمبیلی کا پھول بھی اس کام آتا ہے مگر بالکونیوں میں بیٹھی ہوئی خواتین اپنی پسند کا اظہار بالکل انوکھے اور مختلف طریقے سے کرتی ہیں۔ ان کے پاس کاغذ کے بنے ہوئے چھوٹے چھوٹے گیند ہوتے ہیں جن کے ساتھ تقریباً دو گز لمبے دو تین پتلے کاغذ کے فیتے چکے ہوتے ہیں۔ ان فیتوں کا رنگ وہی ہوگا جو بالکونی سے نکلنے والے کپڑے اور جھنڈیوں کا ہوتا ہے۔ رادھر نگہ انتخاب کسی خوش قسمت پر ٹھہری اور ادھر اس شرمیلی بی بی نے بالکونی سے جھک کر ایک مدد گیند تاک کر مے مارا۔ گیند کے درمیان ایک انجیری ہوئی چھوٹی سی پن لڑکے کے لباس میں اٹک جاتی ہے اور وہ اس کے پیچھے لہرتے ہوئے فیتوں کا رنگ دیکھ کر جان جاتا ہے کہ جان جان کس بالکونی میں تشریف فرما ہے۔ بہر حال اس وقت میں ایک سمینا نا انگریز کے ساتھ ثوریا کی کالیے دے کلاڈ پر کھڑا تھا اور سہا سے گرد و خوں بوت پاسیو جاری تھا۔ ٹوٹی ابھی تک موٹی لڑکی کے عطا کردہ خطاب "ہے ثورو" پر ہیچ و تاب کھا رہا تھا۔ بل فاسٹر کی پتھی "وہ بار بار بڑبڑاتا۔ ہم دونوں ایک ہی جگہ پر کھڑے ہو تو فوں کی طرح دائیں بائیں اور اوپر بالکونیوں کی جانب آنکھیں کھارہے تھے کہ فٹ پاتھ کی ایک کرسی پر بیٹھا ہوا بڑھاپا کھڑک سہا سے پاس آ گیا۔

”سینر آپ شاید غیر ملکی ہیں اس نے علامت سے کہا“ اگر آپ پاسیو میں شامل ہونا چاہتے ہیں تو براہ مہربانی لڑکوں کے حصے کی طرف چلے جائیے۔ یوں لڑکیوں کے بیچ کھڑے ہونا خلاف آداب ہے۔“

”ضرور۔ ضرور۔“ ٹونی نے مرعوب ہو کر کہا اور ہم دونوں دوسری جانب جا کر پاسیو یعنی پریڈ میں شامل ہو گئے۔ اکثر لوگ ٹونی کو بے حد دلچسپی سے دیکھ رہے تھے۔ پستہ قد سپانینوں کے درمیان وہ یوں دکھائی دے رہا تھا کہ جیسے لونوں کی دنیا میں کوئی بارش دیو گھس آیا ہو۔ وہ بے حد تیز چل رہا تھا۔ میں نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھ دیا۔

”ٹونی میرے بھائی ذرا آہستہ..... اطمینان سے۔ ہمیں کونسا گاڑی پکڑنی ہے۔ ہر لڑکی کو گھومنے کی بجائے صرف ایک کو منتخب کرو اور اس پر نگاہیں مرکوز رکھو۔“

میں پاسیو میں تیار اگر میوں کے ہلکے پھلکے شوخ لباس میں ملبوس شازوں پر سفید یا کالی شال۔ کالے بھور بالوں میں جمیلی کے پھول۔ ہونٹوں سے وہی دہی مہنسی پھونکتی ہوئی، اس کا زندہ جسم لباس کی موجودگی سے بے نیاز۔ علیحدہ اور متناسب۔ حرکت کرتا ہوا انتخاب ہو رہا تھا۔ جو یہ مرحلہ طے کر چکی تھیں انھوں نے اپنی مسکراہٹیں بھی مخصوص کر دی تھیں۔ وہ چلتیں تو ان کی گردن دھیرے دھیرے ایک خاص زاویے سے مڑتی رہتی۔ نگاہیں اپنے پسندیدہ لڑکے پر مرکوز۔ ادھر وہ خوش قسمت سینور بھی دنیا و مافیہا سے بے خبر بلکہ دوسری لڑکیوں کی موجودگی سے بے خبر اسی پر نظریں جمائے انجیلیوں کی طرح چلتا رہتا۔ اگرچہ درمیانی مدفاصل کو عبور کرنا پاسیو کے آداب کے خلاف ہے مگر پھر بھی ہر ایک کی یہی خواہش تھی کہ وہ اس غیر مرئی لکیر کے قریب تر ہو کر چلے تاکہ جو مہنی اس کی منزل مراد چلتی ہوئی نزدیک آئے سلسلہ راز و نیاز شروع کیا جا سکے۔ پاس آتے ہی

دونوں جانب سے کھسکھس کا آغاز ہو جاتا۔ لڑکی مائل کرم ہوتی تو باؤں سے پھول اتار کر سونگھتی اور مسکراتی درد نہ صرف خوبصورت ناک سیکڑنے سے ہی دفع دُور کا مطلب واضح کر دیا جاتا۔

ہم ایک سچی بھائی بالکونی کے نیچے سے گزے تو اوپر سے تین چار گیند آئے اور میری قمیض میں اٹک گئے۔ بالکونی کا رنگ نیلا تھا اور گیندوں کے پیچھے لہرائے والے لمبے نیتے بھی نیلے تھے۔ میں نے اوپر دیکھا چار حسین چہرے ہسپانوی بچکوں کی آڑ میں صرف آنکھیں نظر آرہی تھیں۔ مہنستی ہوئی اشتراکات سے بھرپور! دوسری بالکونی کے نیچے بھی اسی قسم کی بارش کا سامنا کرنا پڑا۔ یہاں کا رنگ سرخ تھا..... پھر سبز آیا۔ گیندوں کے پن مجھے چھو رہے تھے اور ان سے چپکے مختلف رنگوں کے نیتے کسی اسیل مرغ کی دم کی مانند لہرا رہے تھے۔ میں نے ایک ایک کر کے انھیں قمیض سے علیحدہ کیا اور فٹ پاتھ پر پھینک دیا۔

”بیوقوف“ میرے قریب چلتے ہوئے ایک لڑکے نے بے حد غصے سے کہا اور پھر جھک کر گیند سمیٹنے لگا۔

اس وقت تو مجھے اس کی بدکلامی پر بے حد تعجب ہوا مگر کچھ عرصہ بعد جب میں نے اس واقعہ کا ذکر میڈرڈ میں ایک دوست سے کیا تو اس نے جلتے ہوئے بتایا کہ ان گیندوں کو یوں پھینک کر میں نے یقیناً بے وقوفی ہی کا ثبوت دیا تھا بالکونی میں بیٹھی ہوئی کوئی سی لڑکی جب کسی لڑکے پر نیتے والا گیند پھینکتی ہے تو یہ اس تنا کا اظہار ہوتا ہے کہ وہ پاسیو کے اختتام پر نیتوں کے رنگ کو دیکھ کر اسی رنگ کی بالکونی ڈھونڈے اور اوپر جا کر گیند پھینکنے والی خاتون کا شکریہ ادا کرے۔ شکریے کے بعد بات آگے بھی بڑھانی جاسکتی ہے۔ کسی لڑکے پر پھینکے جانے والے گیندوں کی تعداد سے اس کی مقبولیت کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔

نظر آرہی تھی..... سفید شال پیٹے خاموش آنکھوں والی لڑکی اس کے فوجوان
چہرے پر امید اور باؤسی کی پرچائیاں تھیں، وہ میرے قریب سے گزرتی تو آنکھیں جھپکا
لیتی..... میں پیچھے مڑ کر دیکھتا تو اس کی لمبی پلکیں مجھوں کو چھو رہی ہوتیں ٹھنڈی
اگ کی آماجگاہ۔ اُداس آنکھیں..... پاسیو جابری رہا اور وقت گزرتا رہا۔ شاید
صدیاں بیت گئیں۔

ثوریا کی شب بیدار رہی تھی۔ کالیے دے کلاڈ کے سوا تمام گلی کوچوں کی
روشنیاں ایک ایک کر کے بجھتی چلی جا رہی تھیں۔ وہ میرے قریب پہنچی تو اس کے
قدم ٹک گئے۔ اس کی خوابیدہ آنکھیں مجھ پر تھیں جیسے کہہ رہی ہوں کہ اے
اجنبی تم آج کی شب ثوریا میں کیوں چلے آئے؟..... تم نے اپنی منزل پر
پہنچنے کے لیے کسی اور راستے کا تعین کیوں نہ کر لیا؟ اس نے اپنی گردن میں
ہلکا سا خم دے کر بالوں میں سے جمیلی کا ایک شگوفہ اُتارا، اُسے اپنے لبوں سے
چھوا، اور پھر سر جھکا کر چلی گئی..... جمیلی کا شگوفہ وہیں مڑک پر پڑا تھا اور پاسیو
میں حصہ لینے والی لڑکیاں اُسے روندتی ہوئی چلی جا رہی تھیں..... ایک مختصر
چابست! آغاز کے بغیر ایک اُداس انجام۔

ہم ہٹل واپس آ رہے تھے تو پاسیو کی خوشبو میرے بدن میں رچی ہوئی تھی۔
دبی دبی ہنسی اور سینکڑوں قدموں کی چاپ ابھی تک میرے کانوں میں گونج رہی
تھی۔ ہلے چہرے اس انوکھے اور خوبصورت تجربے کی شدت سے دھک
رہے تھے۔ سیاحت تو دیوانگی ہے، مگر ثوریا کو چھوڑ کر چلے جانا بھی تو دیوانگی تھی،
مجھے نکل صبح ثوریا چھوڑ کر چلے جانا تھا۔ کل! اور آج.....؟ آج میں نے تشالہ
کے ان دور دراز ریگزاروں کے درمیان کوہستانی راستوں اور اجنبی گھاٹیوں
میں گھر سے اس شہر ثوریا میں ایک لڑکی کو دیکھا تھا۔ وہ سفید شال میں لپیٹی
بالوں میں جمیلی کے پھول سجائے اپنے راستے پر چلتی گئی۔ جانے کون؟ اُسے

شاید کبھی خیال بھی نہ اُسے گا کہ ایک مرتبہ ایک گناہ غیر ملکی ثوریا کی پُراسرار شام میں
اس کی آنکھوں میں سے نکلنے والی اُداس کالی شعاعوں کی زد میں آیا تھا۔ جانے وہ
کہاں رہتی ہوگی..... اس کا پس منظر کیا ہوگا۔ جوں جوں میں کالنے دے کلاڈ سے دُور
ہوتا گیا وہ لڑکی ایک تجربے کی بجائے ایک واسطے، ایک خواب کا روپ و حارتی
گئی..... ابھی سے! آج! اور کل یہ خواب یادوں میں بدلے گئے اور پھر وقت کی
پرماز کے ساتھ یہ یادیں بھی دھندلانے لگیں گی۔ کاش میرا بے کار ذہن اس قابل
ہوتا کہ یادیں حوط کر کے اس میں محفوظ رکھی جاسکتیں۔ مگر یادوں میں ہمیشہ تازگی کی
مہکت نہیں آسکتی۔ نرم و نازک یادوں کے رنگ پھیکے پڑ جاتے ہیں۔ وہ خزاں رسیدہ
پتوں کی مانند بکھر جاتی ہیں۔ جمیلی کے شگوفوں کی طرح بالآخر کھٹک جاتی ہیں۔ افلاطون نے
کہا تھا: ہر خوشی ایلس کے فرائے کی مانند ہے جس کا پانی حکایت کے مطابق
محفوظ نہیں کیا جاسکتا۔ سو ہر لمحے کو اپنے ساتھ وہ تمام خوشیاں لے جانے دو۔
جو وہ اپنے ساتھ لایا تھا۔

اُس رات جب میں سویا تو ثوریا کی شام کے وہ لمحے مجھ سے دُور ہوتے گئے
جن میں حاصل کردہ خوشیاں ایلس کے فرائوں کے پانی کی طرح لاکھ چاہنے پر
بھی میرے ذہن میں محفوظ نہیں ہو سکتی تھیں۔ تمام شب ثوریا کا مترنم اور نسوایت
سے بھر پور نام میرے ذہن کی خاموش جھیل پر چاندی کی بارش کی طرح برستا
رہا۔ ثوریا! ثوریا! ثوریا!

مدینہ سالم

دوسری صبح روانگی سے پیشتر ہم نے حسب سابق ہوٹل کے وسیع غسل خانے کے تمام شاورز کھول کر غسل فرمایا اور حسب معمول نیچریں زیب تن کر کے ٹائل بسفر ہوئے۔ ادھر ٹوریا سے نکلتے ہی اولین پٹرول پمپ کی قربت سے جیپ ڈیئر کی پیاس بھی عود کر آئی اور وہ جھلی مانس تب تک ٹس سے مس نہ ہوئی جب تک اس کے شکم میں مبلغ تین سو پینتیس کا پٹرول نہ انڈیل دیا گیا۔

ہم ٹوریا کی بنفشی پہاڑیاں عبور کر رہے تھے تو میں نے شہر پر آخری نگاہ ڈالی۔ قتالیہ کے دور دراز ریگزاروں کے درمیان کوہستانی راستوں اور گھاٹیوں میں گھر سے اس شہر کی جانب جہاں کل شب پاسیو میں، میں نے اُداس آنکھوں والی ایک لڑکی کو دیکھا تھا۔ سفید شمال۔ سفید چیمبی کے پھول — شاید وہ بھی اس وقت سفید روشنی میں منائے ہوئے سرخ چھتوں والے کسی مکان کے آئین میں بیٹھی اس اجنبی کے باسے میں سوچ رہی ہوگی، جو اس کی آنکھوں سے نکلنے والی شاعری کی زد میں آیا تھا۔

”کیوں بھٹی موشان کیا سوچ رہے ہو؟“ ٹورنی نے ایک ہاتھ سے سٹیرنگ وکیل کو سہارا دیا اور دوسرے سے مشکیزہ پچکا کر شراب کی ایک تپلی دھار ملن میں اتارتے ہوئے پوچھا۔

”ہوں!“ ٹوریا کا سحر ریزہ ہو گیا۔ کچھ بھی نہیں، میں نے سر جھٹکا اور

ڈیش بورڈ میں سے ہسپانیہ کا نقشہ نکال کر اپنے گھٹنوں پر پھیلا لیا۔ آل میزان کے قصبے کے قریب ہم نے ایک مرتبہ پھر دریائے دویرو عبور کیا۔ اگلا قصبہ مدینہ سلتی تھا جہاں ہم دس بجے کے قریب پہنچ گئے۔ قصبے سے باہر ہم ایک قہوہ خانے میں ناشتے کے لیے رُک گئے۔ میرے سامنے عربوں کا مدینہ سالم خشک اور زنجیر پہاڑیوں کے درمیان ایک عمر رسیدہ بوڑھے کی مانند تیز دھوپ میں سستار ہوا تھا۔ زندگی کی حرارت اور گہما گہمی سے یکسر عاری، ایک معمولی اور غیر موثر قصبہ۔ المنصور ابن عامر یہیں کہیں ان سفید مکانون اور چٹیل پہاڑیوں تلے ابدی نیند سو رہا تھا۔

قرطبہ کے ایک وکیل کا بیٹا عامر جس کے لیے دربار میں ایک معمولی عرضی نویسی کی ملازمت اس سنہری زینے پر پہلا قدم ثابت ہوئی جس کی معراج اُسے اندلس کی وزارتِ عظمیٰ تک لے گئی۔ زمانہ طالب علمی میں مسجد قرطبہ کے صحن میں اُسے بے حد سنجیدہ اور خاموش دیکھ کر اس کے دوستوں نے پوچھا: ”عامر تم آج اتنے خاموش کیوں ہو؟“

اُس نے منایت متانت سے جواب دیا۔ ”میں اس وقت کے بارے میں سوچ رہا ہوں جب مجھے اندلس کی وزارتِ عظمیٰ پر فائز ہو کر اس ملک کے تمام اہل حل کرنا ہوں گے، جو اس کے دوست بے حد محفوظ ہوئے اور بننے لگے۔ عامر نے غصے سے کہا، ”میں واقعی عنقریب اندلس کا وزیر اعظم ہونے کو ہوں۔ ابھی وقت سے اپنے لیے جو کچھ مانگنا ہے مانگ لو، ایک نئے مافقہ کا قاضی بننے کی خواہش کا اظہار کیا۔ دوسرے نے پولیس کے حاکم اعلیٰ کا عہدہ مانگا۔ تیسرے نے کہا۔ مجھے باغات کا شوق ہے۔ میں قرطبہ کے باغوں کا نگران بننا پسند کروں گا۔ چوتھے دوست نے آگے بڑھ کر منصور کے گال پر ایک طمانچہ رسید کیا اور حقارت سے کہنے لگا۔ تیری لگی بارہ پشتوں میں بھی کوئی

اگر اندلس کی وزارتِ عظمیٰ کو پہنچا، تو مجھے گدھے پر اٹا سوار کر کے شہر میں گشت کروانا۔ چند برس بعد قرطبہ کے بچوں کے جرمِ بغیر کے درمیان یہی طالب علم گدھے پر اٹا سوار اس روز بد کو کوس رہا تھا جب اُس نے اپنی رضامندی سے اس خواہش کا اظہار کیا تھا۔

تاریخ ابن لین پول کے مطابق عبدالرحمن سوم نے جس عظیم اندلس کے خواب دیکھے تھے، ان کی تعبیر المنصور کے عہد میں ظہور پذیر ہوئی۔ اس کی قوتِ برداشت کا یہ عالم تھا کہ ایک مرتبہ اپنے وزراء کے ساتھ انتظامی امور پر بڑے اطمینان سے محو گفتگو تھا۔ یکدم دربار میں گوشت کے جلنے کی ناگوار بو پھیل گئی معلوم ہوا کہ شاہی جراح المنصور کی ٹانگ پر آئے ہوئے ایک زخم کو گرم لوسے کی ایک سلاخ سے داغ رہا ہے۔ انتظامی امور کے علاوہ وہ فنِ حرب میں بھی باکمال تھا۔ ہر سال موسمِ بہار اور خزاں میں ایک طے شدہ پروگرام کے مطابق وہ بارسلونا، پامپلونا، نوارا، لیان اور قشتالیہ کی عیسائی ریاستوں پر حملہ آور ہوتا۔ لیان کے شہر کی فصیل میں مندم کرنا اس کا محبوب مشغلہ تھا۔ اپنے چھتیس سالہ عہد میں پچاس سے زیادہ جنگوں میں حصہ لیا اور ہمیشہ کامران لوثا۔ ابن ابی عامر اسی لیے تاریخ میں المنصور یعنی فاتح کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ ہر معرکے سے واپسی پر وہ اپنے لباس پر جمع شدہ خاک بڑی احتیاط سے جھاڑتا اور اسے ایک ڈبہ میں محفوظ کر لیتا۔ قشتالیہ کے خلاف ایک مہم سے واپسی پر وہ مدینہ سنی میں علیل ہوا اور چند روز بعد اندلس کا یہ جبریٰ فرزند راہی ملکِ عدم ہوا۔ اس کی وصیت کے مطابق چالیس معرکوں میں جمع شدہ خاک اس کے چہرے پر چھڑکی گئی۔ اور اُسے اُس کفن میں دفنایا گیا جو اس کے ذاتی کھیت کی روٹی سے اس کی اپنی بیٹیوں نے کاٹا تھا۔ عیسائیوں نے اس کی موت پر جس طرح اطمینان کا اظہار کیا، وہ ایک راہبِ مذہب سے کے ان الفاظ سے ظاہر ہوتا ہے۔ ۱۰۰۲ء میں المنصور

مرگیا اور جنم میں دفن ہوا۔ تاریخ کی ایک قدیم کتاب میں اس کے کتبے کی عبارت کچھ یوں رقم ہے:-

”اُس کی نشانیاں تمہیں اُس کی خبر بتلائیں گی۔ گویا تم اُسے اپنے سامنے دیکھ رہے ہو، اس جیسا زمانہ کہیں نہ رکھے گا۔“

آج مدینہ سنی میں اس کی قبر جانے کس مکان، کونسے کوسے اور کس کنڈتے سے۔ اُس کی کوئی نشانی نہیں اس کی خبر نہیں بتلاتی۔ ہاں تاریخ گواہ ہے کہ اُس جیسا زمانہ کہیں نہ رکھے گا۔

مدینہ سنی کے بعد ہم گواڈل جبارہ کے قصبے سے گزرتے جسے اہل عرب دادی الجبارہ بھی کہتے تھے اور مدینۃ الفرج بھی۔ یہ قصبہ جو گئے وقتوں میں ایک اہم شہر تھا۔ موسیٰ اور طارق کی مستندہ افواج کے ہاتھوں فتح ہوا۔ مشہور مورخ اور ادیب علامہ الجباری بھی اسی قصبے کے رہنے والے تھے۔

گواڈل جبارہ سے الگ سے ہمارے پیچھے تو دو پہر ہو چکی تھی اور گرمی سردی پر مبنی۔ شرک کے گناہ سے ایک بوڑھا سپاہی چھپرتے بیٹھا تو بوزیج رہا تھا۔ نوئی نے جیپ روک کر ایک تر بوز حیدر اسے چیرتے ہوئے اُس نے ایک مرتبہ پھر اپنی قصاصیت کا مظاہرہ کیا اور نہایت نفیس کمرے کاٹے۔

ہمارے سپانیہ کے مایہ ناز ادیب سروانتیس کی جائے پیدائش ہے جس کی شہرہ آفاق کتاب ”ڈان کے خوتے“ کا حوالہ میں نے اس کتاب کے پہلے باب میں دیا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ اسی قصبے سے طارق کو وہ بیش قیمت میز دستیاب ہوئی تھی جو بعد میں اس کے اور موسیٰ کے درمیان تنازعے کا باعث بنی۔

الگ سے ہمارے کچھ فاصلے پر ہم دھول سے آئی ہوئی اس شرک سے عداوت جس نے پچھلے دور و ز سے قشتالیہ کے کھلے میدانوں اور بے آب گاہ پہاڑوں میں ہمارا ساتھ دیا تھا۔ ہم ایک دو طرفہ اور کشادہ شرک پر اُگے تھے۔

بائیں ہاتھ ایک بورڈ نظر آیا "ہوائی اڈہ بائیں جانب" بے ترقیبی سے بکھری ہوئی
ڈوبنا جدید عمارتیں جن میں سے بیشتر زیر تعمیر تھیں۔ کریں اور مل ڈوزر سر اٹھائے
کھڑے تھے۔ نیون سائن جو دن کی روشنی میں لوہے کے کھنڈر لگ رہے تھے۔
بے شمار ٹریفک۔ جلتی بجھتی ٹریفک کی روشنیاں اور بے پناہ شور۔ ہم ہسپانیہ کے
دار الحکومت میڈرڈ میں داخل ہو رہے تھے۔

گویاکہ..... میڈرڈ

مسلمانوں کے عہد میں متعدد عرب قبیلے ایسے بھی تھے جو ہسپانیہ میں سینکڑوں برس
سے قیام پذیر ہونے کے باوجود آبائی خانہ بدوشی کی جس کو رہائے پائے تھے۔ یہ قبائل
شہروں سے دور دریاؤں کے کنارے اور زرخیز وادیوں میں خیمہ زن ہوتے اور پھر
جس صبح گرد و نواح کے مناظر سے اجنبیت کا پہلا پردہ سرکاتا ان کے خیموں کی
طنابیں ڈھیلی پڑ جاتیں، مینیں اکھڑتیں اور وہ ایک مرتبہ چران دیکھی سرزمینوں کی
تلاش میں وہاں سے کوچ کر جاتے۔ ایک سیاح کی مانند کسی انجانے مقام پر اسپینی
کی حیثیت سے وارد ہونا ان کے لیے زندگی کا سب سے بڑا جذباتی تجربہ ہوتا تھا۔
ایک ایسے ہی صحراور قبیلے نے دریائے مینزناں کے کنارے ایک بلند ٹیلے
پر ایک حصار تعمیر کیا اور اسے مجریط کے نام سے پکارا۔ مجریط صدیوں قریطہ،
غزناطہ اور اشبیلیہ ایسے چمکتے شہروں کی روشنی تلے گناہی کے اندھیروں میں جھلکتا
رہا۔ ۱۵۶۱ء میں فلپ دوم نے کتب خانہ و خانقاہ ال اسکوریل کی تعمیر کے دوران
یہاں چند برس قیام کیا اور اس کی مرکزیت کو ملحوظ رکھتے ہوئے اسے ملک کا
صدر مقام قرار دیا۔ اسی مرکزیت کی بناء پر مجریط جواب گبر کو میڈرڈ ہو چکا
سے، ہسپانیہ کا پیٹ بھی کہلاتا ہے۔ آج سے دو سو سال پیشتر تک دریائے
مینزناں کے کنارے عربوں کے تعمیر کردہ حصار القصر کے کھنڈرات موجود تھے۔
اب وہاں شاہی محل کی عالی شان عمارت کھڑی ہے اور میڈرڈ اس کے گرویل ہمیل

تک پھیلا ہوا ہے۔ ہسپانیہ کی قدیم تاریخ میں ایک نواز شہر۔

پیرائیز کی بلند یوں اور قشتالیہ کے ریگزاروں کو عبور کر کے اب ٹونی کی جیب کا ساٹے کا پتھر کے جنگل میں پائن اور فر کے درختوں تلے کھڑی تھی اور ہم دونوں ٹڈگاڑو پر بیٹھے پچھلے دو روز کے سفر کی یادیں تازہ کر رہے تھے۔ ٹوریا کی شب کا ذکر آیا تو ٹونی جیسا سکھ بھی جذباتی ہو گیا۔

”یقیناً ٹوریا کے پاسیو میں حصہ لینے والی ہسپانوی لڑکیوں کے قدموں کی چاپ افریقہ کے جنگوں تک میرا پیچھا کرے گی۔ واپسی پر اس قہوہ خانے میں ضرور جانا جہاں اُس شب.....“

”اُس شب ٹونی..... ابھی کل کی تو بات ہے۔“

”ہاں شاید کل ہی کی بات ہو مگر مجھے تو یوں محسوس ہوتا ہے جیسے صدیوں بیت گئی ہوں۔“

اس سے پہلے کہ ٹونی کی حالت مزید خیر ہوتی میں نے اپنا رُک سیک کا منڈھے پر ڈالا اور اس سے اجازت چاہی۔

”اُہم“ اس نے مشکل گلا صاف کیا۔ ”یہ شہر بے جان اور ٹول سا لگتا ہے..... تم میرے ساتھ افریقہ کیوں نہیں چلتے؟“

”مگر چتوں اور آدم خوروں سے ملاقات کرنے؟..... ہو گیا نا چھوٹا سا لطیف؟“

”تم کہتے ہو تو ہو گیا“ اُس نے مزہ بنا کر کہا۔ ”مجھے یقین ہے کہ تم واپسی پر ٹوریا میں ضرور جاؤ گے اور پاسیو میں شامل اُس لڑکی کو تلاش کر دے جس نے بالوں میں جھیلی کے پھول سجائے تھے.....“

فرار اور پائن کے درختوں کی چوٹیاں ایک سبز دیوار کی صورت میں سورج کا راستہ روکے کھڑی تھیں۔ روشنی کی ایک کرن بھی مجھ تک نہیں پہنچ رہی تھی۔

”نہیں ٹونی ڈیئر..... تم خود ہی تو کہہ رہے تھے کہ وہ صدیوں پہلے کی بات ہے۔ اگر واپس چلا بھی جاؤں تو ہو سکتا ہے اُن ہنسی پہاڑیوں کے درمیان ٹوریا کا وجود بھی نہ ہو..... بہر حال لنٹ کا شکریہ! اور ٹونی تمہاری رفاقت میں یہ طویل سفر بے حد خوشگوار طریقے سے کٹا.....“

”تم دوبارہ کہہ سکتے ہو!..... لاؤ اب ایک سگرٹ تو پلاؤ..... اب ہوا ہے نا ایک چھوٹا سا لطیف۔ کیوں مومن؟“ ٹونی کی جھاڑی وارھی میں حرکت ہوئی اور درمیان میں سے اس کا مخصوص قہقہہ برآمد ہو گیا۔

”ہاں ہو گیا۔ میں نے اُسے سگرٹ ملگا کر دیتے ہوئے اعتراف کیا۔ خدا حافظ ٹونی!“

ایک طویل کش لگانے کے بعد اُس نے وارھی کھلائی۔ میرے دونوں کندھوں پر تھپکی دی اور جیب میں سوار ہو کر چابی گھما دی۔ درختوں میں چند نیم خوابیدہ پرندے انجن کی آواز سے خوفزدہ ہو کر پھڑپھڑانے لگے۔ کاسٹلے کا پتھر کی کچی چھت ڈھلی پر دھول اُٹھی اور ٹونی کی جیب نظروں سے اوجھل ہو گئی۔

پائن کے ایک درخت کے تنے پر لیوٹھ ہوٹل بائیں جانب کی تختی آویزاں تھی، میں ایک پہاڑی قلی کی طرح کندھوں پر بوجھ اٹھاتے سر جھکا کر آہستہ آہستہ چلنے لگا۔ جنگل کے وسط میں کھڑی کے ایک کرم خوردہ پھانک پر ”میڈرڈ لیوٹھ ہوٹل“ کے الفاظ کھسے دکھائی دیے۔ کراڑو کھیل کر میں نے اندر بھانکا۔ دھول میں اٹا ہوا ایک وسیع و عریض سنان صحن میڈرڈ کی تپتی دوپہر میں چمک رہا تھا۔ بائیں ہاتھ پر ایک بزرگ ماسادہ سی عمارت تھی۔ فرلانگ بھر کا فاصلہ طے کرنے کے بعد جب میں عمارت میں داخل ہوا تو اندر بالکل خاموشی تھی ٹھنڈک اور نیم تاریکی۔ میں نے رک سیک کا منڈھے سے اتار کر اپنے تئیں ایک خالی بستر پر رکھ دیا۔

”کن ہے؟“ بستر پر لیٹے ایک ہیولے نے اپنے پیٹ پر رکھے رُک سیک کر بے مدخوف زوہ ہر کر ٹھولتے ہوئے دریافت کیا۔
”میں ہوں!“ میں نے جلدی سے رُک سیک اٹھایا۔ ”یہ جگہ یوتھ ہوٹل ہی ہے نا؟“

”یہ جگہ..... ہیولے صاحب اٹھ کر بیٹھ گئے اور دونوں ہاتھ سینے پر باندھ کر ٹھیک گئے۔ یہ جگہ قدیم مصر ہے۔ فرعون رمیس کی سواری آرہی ہے۔“
”ہیلو“ میں نے خوش دلی سے کہا۔
”ہائے! ہائے! ہا..... مخالف سمت میں ایک بکر پر آدھا لیٹا آدھا بیٹھا ہتی غنودگی کے عالم میں بڑبڑایا۔

”لو! لو! لو!“ کسی صاحب نے بکر کے نیچے سے ہاتھ نکال کر میری ٹانگ پر پڑی۔

”آپ سے مل کر بے حد مسرت ہوئی۔ میں نے مسکرا کر نیچے جانا۔
نیم ڈامسکراہٹ لبوں پر سجائے اب وہ صاحب گتار کو آغوش میں دبوچے آؤنگے رہے تھے۔

میری نظریں تاریکی کی عادی ہوئیں تو انکشاف ہوا کہ ہوٹل کے بکروں پر درجنوں حضرات نروان کی مختلف منزلوں کی طرف رواں ہیں۔ ایک حبشی لڑکا میری جانب ٹھکی باندھے تب تک آنکھیں جھپکا تا رہا جب تک میں نے بھی اُسی رفتار سے آنکھیں جھپکا کر اُسے ”ہیلو“ نہ کہہ دیا۔ قندھار کے ہوٹل میرا غلط میں جس بُرے واسطہ پڑا تھا اُس کی جگہ ان فضاؤں میں بھی رچی بسی تھی۔
اتنے میں ہوٹل کی ایک کھڑکی کے پٹ کھلے اور ایک یونانی نقوش کا حامل نوجوان چھلانگ لگا کر اندر آگیا۔

”کھڑکی!..... بند کر دو۔ روشنی!..... نہیں چاہیے۔“ ٹنگ باباؤں

نے آنکھیں ڈھانپتے ہوئے دھیرے دھیرے احتجاج کیا۔ نوجوان نے باواؤں بند ہسپانوی میں چند ناپسندیدہ الفاظ کہے اور کھٹاک سے کھڑکی بند کر دی۔
”آپ بھی شاید میری طرح یہاں نواد رہیں؟“ میں نے دریافت کیا۔

”نہیں۔ نہیں.....“ اس نے شانوں تک آئی ہوئی زلفوں کو جھٹکا اور بے دھیانی میں بولا۔ ”میں تو داروُن کی لڑکی سے ملنے گیا تھا۔ پچھلے میں رُنے پتیا کر رہا ہوں مگر وہ کینوت تو برازیلین لڑکیوں سے بھی گئی گزری ہے۔ مانتی ہی نہیں۔ ہر روز پوری دوپہر داروُن صاحب اپنی چیتتی مرغیوں کو واڑ ڈالتے ہیں اور میں ان کی چیتتی..... خیر..... تم کون ہو؟“
میں نے اپنا تعارف کر دیا۔

”اچھا اچھا تو ایسے ہوتے ہیں پاکستانی!“ اس نے سر سے پاؤں تک میرا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔ ”تم میرے پہلے پاکستانی ہو۔ اور پھر بڑی گرجوشی سے ہاتھ دایا۔“
”میرا نام بانکو ہے۔ برازیل سے آیا ہوں۔ صرف عام میں مجھے بانکو دی برازیلین کہا جاتا ہے۔ میڈرڈ ٹولپسند نہیں آیا، البتہ یہاں کے داروُن کی بیٹی پسند آگئی ہے۔“
”مجھے تو یوں لگتا ہے جیسے ہوٹل کے کسی بھی مکین کو میڈرڈ پسند نہیں آیا جو کہ وقت شہر کی سیر کی بجائے عالم بالا کی سیر کر رہے ہیں۔“

”یہ حضرات؟“ اس نے آؤنگتی ہوئی مخلوق کی جانب اشارہ کرتے ہوئے تمقہ لگایا۔

”یار تمہیں یسوع مسیح کا واسطہ خاموشی سے ہنسو۔ ایک مخلوق نے احتجاج کیا۔

”ہسپانوی بندرگاہ الجیرس سے مراکش صرف دو گھنٹے کی مسافت پر واقع ہے۔ بانکو نے سرگوشی کی۔“ اور وہاں اعلیٰ قسم کی خشیش کی اتنی بہتات ہے کہ سبزی فروش بھی آلوں اور ٹائروں کے ساتھ سے ٹوکروں کے حساب سے فروخت

کرتے ہیں چنانچہ اپنے یہ بپتی بجائی مراکش میں قدم رکھتے ہی سٹون ہو جاتے ہیں؟
”سٹون؟ یعنی پتھر ہو جاتے ہیں؟“

”نہیں سٹون یعنی دھت ہو جاتے ہیں۔ مکمل زردان۔ اور پھر جب تک مراکش حکومت انھیں کان سے پکڑ کر ملک سے باہر نہیں کر دیتی یہ وہاں سے ٹس سے مس نہیں ہوتے۔ ہسپانیہ واپسی پر ان کے رُک بیگنوں میں غلیظ بنیادوں اور جرابوں کے نیچے سیروں حشیش بھری ہوتی ہے۔ اکثر کچڑے جاتے ہیں، اور ہسپانوی جیلوں میں سڑتے ہیں۔ جو بچے نکلتے ہیں وہ سیدھے میڈرڈ کے یوتھ ہوٹل میں چلے آتے ہیں۔ یہاں کے وارڈن کو جیسا کہ میں پہلے بتا چکا ہوں اپنی مرغیوں سے ہی فرصت نہیں۔ اس لیے یہ حضرات خوب کھل کھلتے ہیں بلکہ کھل پیتے ہیں۔“

”یہاں خوب گڈے گی۔ میں نے اپنا سونے کا تھیلہ بستر پر بچھا دیا۔ اور لیٹ کر ڈائری لکھنے میں مشغول ہو گیا۔ جس مدد بھری فضا میں سانس لے رہا تھا وہاں زیادہ دیر تک ذی ہوش رہنا ممکنات میں سے تھا چنانچہ تھوڑی دیر بعد میں نے ڈائری بند کر دی اور اُد گھنے لگا۔“

آنکھ کھلی تو دس بجنے کو تھے اور حسب سابق ہر سونا موشی تھی میں نے بانکو کی جانب دیکھا وہ نہایت باربط قسم کے خراٹے لے رہا تھا۔ اتنے میں دردرازہ کھلا اور صرف ایک نیکر میں ملبوس عمر رسیدہ وارڈن کا ندھے پر بندوق جمائے اندر داخل ہوا۔ اس نے فوجی انداز میں ایڑھیوں پر گھوم کر دروازہ بند کیا اور پھر ہوٹل کی راہداری میں باقاعدہ پریڈ کرنے لگا۔ دوپکڑ لگانے کے بعد اُس نے بندوق کندھے سے اتار کر بغل میں داب لی اور پورا امنہ کھول کر کاشن دینے لگا۔ ”لو کو! دس بج رہے ہیں۔ اب قانونی طور پر تم اس ہوٹل سے باہر نہیں جاسکتے۔ صدر دروازہ مقفل کر دیا گیا ہے۔ روشنیاں گل کر دو۔“

روشنیاں پہلے سے ہی گل تھیں، اور سوجاؤ (سب لوگ سو رہے تھے) شب بخیر! اس تقریر کے بعد وارڈن نے حسب سابق دو مرتبہ راہداری میں مڑ گشت کی اور پھر دروازہ کھول کر پریڈ کرتا ہوا باہر نکل گیا۔ اس کے باہر نکلنے کی دیر بھی کہ تمام مردہ اجسام نے پھلانگیں لگائیں اور بستروں سے باہر آ گئے۔ ”براؤ۔ دیوا۔ ہڑے۔“ متعدد زبانوں میں زندہ باد کے نعرے گونجنے لگے۔ تمام بقایا روشن کر دی گئیں۔ نیکر کے نیچے لیٹا ہوا گتا رہ جانے لگا۔ اگر واقعی بغلوں کو بجایا جاسکتا ہے تو وہ اس وقت بجائی جا رہی تھیں۔

”باجو بجائی! میں نے بانکو کے دیوا دیوا میں مداخلت کرتے ہوئے دریافت کیا کیا سلسلے میں؟“

”اب میڈرڈ کی سیر کا وقت ہے۔۔۔۔۔۔ دیوا! اس نے نعرہ لگایا۔“
”لیکن صدر دروازہ مقفل ہے اور باہر وارڈن صاحب بندوق لیے ٹھل رہے ہوں گے۔“

”صدر دروازے کے پہلو میں جو پتھر نصب ہے اس پر چڑھ کر دیوار بکسانی پھلانگی جاسکتی ہے اور وہی ۱۹۳۶ء کی زنگ آلود نشانی وارڈن صاحب کی بندوق تو وہ خانہ جنگی کے بعد آج تک کارٹوس کے لمس سے آشنا نہیں ہوئی بلکہ شاید اُن دنوں بھی نہیں ہوگی۔ بہر حال تم ٹکرنا کرو تمام دن بستروں میں پڑے اُد گھٹنا اور پھر پوری شب میڈرڈ کی آوارہ گردی کرنا اسس ہوٹل کے میکنوں کی روایت ہے۔“

تھوڑی دیر بعد پوری قوم سچ بن کر زیر زمین ریلوے اسٹیشن پر میڈرڈ کے مرکز ”پورتا دیل سول“ جانے والی گاڑی کے انتظار میں کھڑی تھی۔ گاڑی آئی تو یوں لگا کہ جیسے مغلیہ لوگوں میں زیر مرمت کسی مال گاڑی کو دھکیل کر اسٹیشن کے اندر بھیج دیا گیا ہو۔ البتہ یہاں مال گاڑیوں ایسی وسعت ناپید تھی کہ ہر

مسافر ٹھننے پڑے تھے۔ فیصلہ جسے دیا گیا کہ گاڑی میں سوار ہونا ناممکنات میں سے ہے۔ ندوی کو چونکہ لاہور کی اومنی لیبوں میں سوار ہونے کا وسیع تجربہ تھا اس لیے یہاں بھی چنڈاں و شواری پیش نہ آئی۔

پورتاویل سول یعنی "باب شمس" میڈرڈ کا ثقافتی اور تجارتی مرکز ہے۔ کلاسیکی طرز تعمیر کی چند عمارتیں ایک نیم دائرے کی شکل میں اسے گھیرے ہوئے ہیں اور اس کے وسط میں سے میڈرڈ کی دس شاہراہیں جہنم لیتی ہیں بلڈنگز نئے پورتاویل سول کی تعریف میں زمین و آسمان کے قلابے ملا دیئے مگر مجھے اس "باب شمس" میں سے خوبصورتی کی کوئی شعاع طلوع ہوتی نظر نہ آئی میڈرڈ لینڈز یعنی میڈرڈ کے باشندوں کی وضع قطع بھی دوسرے یورپی ملکوں کے باشندوں کی نسبت تصباتی اور عامیادہ ہے۔ البتہ ان کے چہروں پر انگریزوں کی سنجیدگی، جرمنوں کی کرجھی، روسوں کی کاروباری مسکراہٹ اور اطالویوں کی شاطراہ ہنسی مقفود تھی۔ یہ چہرے ایک کھلی کتاب تھے۔ تازہ ہنس مکھ اور لمبے نگرے میڈرڈ میں مجھے کوئی خاصیت ایسی نظر نہیں آئی جسے خالص میڈرڈی کہا جاسکے۔ قہرہ خانوں پر امریکی پھاپ ہے۔ ملبوسات کی دکانوں پر فرانسیسی رنگ غالب ہے اور طرز تعمیر بھی کسی طور منفرد نہیں۔ دل سول سے دائیں ہاتھ والی سڑک کے اختتام پر پلازامیٹر کا خوبصورت چوک ہے جہاں ۱۶۸۰ء میں جنونی بادشاہ کارلوس دوم نے دربار عام لگا کر ڈیڑھ سو سے زائد کافروں کو اذیتیں دے کر مروایا تھا۔ اسی دروازے کے عقب میں درجنوں چھوٹے چھوٹے بازار اور تنگ گلیاں ہیں جنہیں قدامت کی وجہ سے میڈرڈ کا خوبصورت ترین علاقہ شمار کیا جاتا ہے۔ ہانکونے انہی گلیوں میں سے ایک ایسا رینڈران دریافت کیا تھا جہاں بتوں اُس کے دنیا کا ارزاں ترین ڈنروستیا ہوتا ہے ٹھنڈا سوپ، پھلی، تورنلا یعنی اُمیٹ، سویٹ ڈش، کافی اور ان سب کو پتہما کرنے کے لیے

سُرخ شراب صرف پچیس پیسے!

ایک مرتبہ جنوبی فرانس کے انڈوز کے باغوں میں سرشام جانے کا اتفاق ہوا۔ پہلے پہل کسی انگریز کے خوشے میں سے ایک آدھ بھینگر کے بولنے کی آواز بلند ہوئی۔ پھر وقفے کے ساتھ ان میں اضافہ ہوتا چلا گیا۔ آدھ گھنٹے کے اندر اندر میل بمیل تک پھیلے ہوئے باغات ان کے شر سے گونجنے لگے۔ نوبت یہاں تک پہنچی کہ بات کرنی بھی مشکل ہو گئی۔ رات کے تین بجے جب میں بانو کے تجویز کردہ رینڈران میں کھانا کھانے کے بعد کاساٹے کا مپو کے گھنے درختوں میں سے گزرا ہوا تھا تو یہاں بھی ہر سو بھینگروں کا شور تھا۔ البتہ ہسپانوی بھینگرا اپنے فرانسیسی بھائی بندوں کی نسبت زیادہ مضبوط پیپٹروں کے مالک واقع ہوئے تھے۔ یہ جنگ ایک زلٹنے میں شر سے خاصے ناصلے پر تھا مگر بعد میں میڈرڈ کی پھیلتی ہوئی آبادی نے اسے مکمل طور پر اپنی گرفت میں لے لیا۔ اُن دنوں یہ صرف شاہی عائدان کے افراد کے لیے مخصوص تھا اور بطور شکار گاہ استعمال کیا جاتا تھا۔ شکار اب بھی ہوتا ہے مگر شکاری شہزادوں کی بجائے ہسپانوی نوجوان ہوتے ہیں اور شکار جانوروں کا نہیں متناسب جسم کی مالک اُن جرمن اور سوئڈش لڑکیوں کا کیا جاتا تھا جو شام ڈھلے جنگ کے مختلف حصوں میں واقع قہرہ خانوں میں بیٹھی آنکھیں جھپکتی ملتی ہیں۔ اسی قسم کا ایک قہرہ خانہ ہوشل کے رستے میں بھی پڑتا تھا جہاں اس وقت بانو سمیت ہوشل کے تمام میکین ہٹر لونگ بچا ہے تھے۔ سوئڈش لڑکیاں دافر لعدا میں۔ سُرخ شراب مشکوں کے حساب سے اور موسیقی ہوشل والے ہپی لڑکے کی گتار میں سے اُبلتی ہوئی۔ ایک غیر ملکی لڑکی لگیوں میں کاسترنات پر ڈھے میز پر کھڑی بولیروقص ناچنے کی کوشش میں۔ بانس کے ساتھ بندھے رستے سے جھولتے ہوئے رنگ برنگے قفے۔ میں پاس سے گزرا تو بانو نے مجھے بھی دبوچ لیا۔

قہر خانے میں رات جگا۔ تیسرے روز فرست بنا کر میڈرڈ کے قدام قابل دیدار مقامات کو بھگتایا اور آج صبح کالے دسے الکالے پر واقع سفری اداسے تھامس لگ سے پاکستان کی ڈاک وصول کر کے اب میں پچھلے دو گھنٹوں سے پلازا ویل نیپ چونا کے ایک قہر خانے کے باہر ہو رشتا کا تیسرا گلاس سامنے رکھے سر کھجلائے میں مصروف تھا، یہاں میری طرح کے سینکڑوں نئے لوگ قطار اندر قطار منہ اٹھاتے فٹ پاتھ پر چلتے ہوئے ان لوگوں کو دیکھ رہے تھے جنہیں زندگی میں اور بھی بہت سے کام تھے۔ مثلاً کسی اور قہر خانے میں جا کر بیٹھنا اور پھر فٹ پاتھ پر چلتے ہوئے ان لوگوں کو دیکھنا جنہیں..... فٹ پاتھ کے ایک سرے پر لاہور کی بیڈن روڈ کی طرح درجنوں بوٹ پالش کرنے والے بیٹھے تھے۔ البتہ یہ حضرات بُرش۔ سٹینڈ پر کھٹکھٹا کر "خوبوٹ پالیش" کے نعرے بلند کرنے کی بجائے اخبار سامنے پھیلائے پچھلی بل فاسٹ کی تفصیلات پڑھنے میں مگن تھے یا اگر کوئی صاحب اُن کی بے خبری سے غاندہ اٹھاتے ہوئے سٹینڈ پر اپنا بوٹ جمادیتے تو وہ شکایت بھری نظروں سے یوں دیکھتے جیسے کہ رے ہوں، "بھلے آدمی بل فاسٹر آل کو روک چکے اتوار بار سلونا کے اکھاڑے میں مرتے مرتے بچا ہے اور تمہیں بوٹ پالش کروانے کی پڑی ہے" بہر حال وہ دو چار مرتبہ بڑی بے دلی سے بُرش چلا کر انہیں فارغ کر دیتے اور پھر باچیں پھیلا کر مطالعہ میں محو ہو جاتے۔ ان کے ساتھ دو بوڑھے ہسپانیہ کی مشہور نیشنل لاٹری کے کوپن گے میں لٹکائے "لاٹری کوپن" کی صدا انہیں بلند کر رہے تھے۔ ہمارے ہاں کی طرح ایک عام ہسپانوی کی ہزاروں خواہشیں ایسی نہیں ہوتیں جن پر اس کا دم نکلتا ہے۔ ان کی تعداد صرف چار ہوتی ہے (۱) بل فاسٹر بننا (۲) جرمنی میں ملازمت کرنا (۳) کسی سوئڈش دوشیزہ کو مکمل طور پر اپنی گرفت میں لانا (۴) نیشنل لاٹری جیتنا۔ خواہش ہر تین ہسپانوی کی باسانی پوری ہوتی

ہائے ہائے کیا کر رہے ہو! میڈرڈ میں رات کے تین بجے بھی کوئی سوتا ہے۔ میرے لیے "ہو رشتا ناؤی شوفا" سنگوایا گیا۔ ناریل ملا دو دھ قسم کا مشروب باپنی "سردانی" جیسا ذائقہ تھا۔ گلاس ختم کرنے کے بعد مجھے یوں محسوس ہوا کہ جیسے کاسٹ کا مپو کے جھینگری ٹرٹر نہیں کر رہے باقاعدہ چائے کو سکی کی سمفنی بجا رہے ہیں۔ گتار کی لئے ہے کہ دل اُترتی ہی پٹی جا رہی ہے۔ جنگل میں سرسراہتی ہوا کچھ زیادہ ہی خوشگوار ہے اور میز پر ناچنے والی لڑکی جو پہلی نظر میں بس یوننی سی لگی تھی اب بہت ہی خوبصورت ہو چکی ہے۔ دوسرے روز معلوم ہوا کہ باکو نے ویٹر کے ساتھ ساز باز کر کے ہو رشتا میں برانڈی کی آمیزش کر دی تھی، تبھی!

صبح سات بجے ہوٹل واپسی پر ابھی ہم بستروں میں ٹانگیں اور بازو پھیلا کر سونے کے لیے مناسب پوزیشن کی جستجو میں تھے کہ دروازہ کھلا اور وارڈن صاحب حسب معمول بندوق تھا سے وارد ہو گئے۔ "حضرات صبح کے سات بج چکے ہیں۔ امید ہے آپ رات مزے سے سوتے ہوں گے۔ اب آپ اچھے ستیاہوں کی مانند تیار ہو کر میڈرڈ کی سیر کو نکل جائیے۔ صبح بخیر! وارڈن نے دروازے سے باہر قدم رکھا تو ایک مرتبہ پھر غرہ ہائے تسکین بلند ہوئے۔ سگرٹوں میں سے تباکو جھاڑ کر اُن میں چرس ملائی گئی۔ کش لگے۔ تھوڑی دیر بعد قبرستان میانی صاحب..... ہر سو مکمل خاموشی!

میں نے سفید ہو رشتا کا ایک گھونٹ پی۔ میز پر بچھرے گھرے آٹے ہوئے خطوط پر ایک سرسری نگاہ ڈالی جنہیں میں تین مرتبہ پڑھ چکا تھا اور پھر سر کھجلائے لگا۔ اب کیا کیا جائے۔

آج میڈرڈ میں قیام کا چوتھا روز تھا۔ پہلے دو روز تو ہوٹل کی روایات کے مطابق گزے یعنی دن بھر پڑے اُٹھنا اور پھر کاسٹ کے

ہے بلکہ اتنی مرتبہ پوری ہوتی ہے کہ واقعی دم نکلنے کو آتا ہے۔ جرمنی میں چونکہ پہلے سے ہی لائسنس ہسپانوی موجود ہیں اس لیے وہاں ملازمت کا بندوبست بھی ہو جاتا ہے، البتہ کل ٹائٹل ہونا اور کروڑوں پیسے کی نیشنل لائسنس جتنا ایسے اڑن ہیں جو کم ہی نکلتے ہیں۔ ان دونوں ایک چھوٹے سے قصبے کی بڑی دھوم تھی جس کے باشندے کئی برسوں سے اجتماعی طور پر نیشنل لائسنس کے کوپن خرید رہے تھے اور بالآخر اس ماہ کروڑوں پیسے کی نیشنل لائسنس ان کے نام نکل آئی تھی۔ وہاں کے تمام مردوں نے کام سے ریٹائر ہونے کا اعلان کر دیا ہے اور اب سارا دن مقامی قہوہ خانے میں بیٹھے گپیں ہانکتے رہتے ہیں۔

میڈرڈ کے باسے میں ٹونی کے تاثرات سو فیصد درست ثابت ہوئے تھے۔ بے جان اور ڈل سا شہر۔ پچھلے چار روز سے میرے جیسے ٹرگر بیسی شخص کے سامنے ایک بھی ایسی عمارت نہیں آئی تھی جسے دیکھ کر کہیں کا بنو جانے کو جی چاہے کسی شہر کے بے جان ہونے کے حق میں اس سے زیادہ مثبت دلیل اور کیا ہو سکتی ہے۔ اپنے عالیجناب میر و بیز قاضی دلی محمد صاحب ہی میڈرڈ آئے۔ سفر نامہ اندلس میں لکھتے ہیں:-

”جدید شہر کے ہوا دار سہفت منزل عمارت۔ کشادہ شوارع۔ پُر فضا باغات۔ محنت افزا چمن۔ پیرس و فرانکفورٹ یاد دلاتے ہیں۔ پٹرولیوں پر قہوہ خانے سجے ہوئے ہیں۔ صہبائے جلیقیہ و شریش کا دور چل رہا ہے۔ برف کی بھرمار ہے۔ برقی پنچ کے علاوہ خوش وضع سبک پنکھیہ کو نازک کلا میاں ایک خاص انداز و لہجہ سے چلا رہی ہیں۔“

قاضی صاحب نے قدیم شہر کا جو نقشہ کھینچا ہے وہ بھی دلچسپی سے خالی نہیں۔ لکھتے ہیں:-

”بجز سڑک و مساکین کے اس کی تنگ، پیچیدہ اور تنگ گلی کوچوں

میں اور کوئی بھلا آدمی نہیں رہتا شکستہ سڑک پر ٹاٹ بچھا ہوا ہے جس پر سامان بساط خانہ کے پاس فریہ اندام اندلسی خاتون مانگ پٹی سے آراستہ برہنہ سر، ہاتھ میں نکھالیے ایک مونڈھے پر بیٹھی گاہکوں کا منہ تک رہی ہے۔ میوہ فروش کباڑن غریبوں کی ڈھیری پر اسی بے تکلفی سے بیٹھی ہے جس طرح پیداوار بناس پر لوٹک کی عیوڑ پٹھانی پیشوا زپہنے تنگ ہو۔ بلبشہ کی کھادی او مالقہ کی اوڑھنیاں ایک طرف فروخت ہو رہی ہیں۔ طلیطلہ کے چاقو دوسری طرف جمع ہیں۔ ایک سافن دو پیسے کے معاوضہ میں آب زلال کا ایک جرعه پیش کر رہی ہے۔ تنباکو فروش ایک ایک پیسہ کے تلخ گلو کو زنگرٹ فروخت کر رہا ہے۔ چتر کھانچوں کے پاس کھڑے ہیں۔“

میں نے ہورٹانا کا چوتھا گلاس منگوایا اور چوک میں ایسا وہ سروا تیس میوہ ریل کے کاسی کے مجسموں کا جائزہ لینے لگا۔ روزی نانتے پر سوار بارش ڈان کے خوتے ہاتھ میں نیزہ تھا۔ اور اس کا دانا وارسا تھی سانچو پانزا پتھر ہانکتا ہوا۔

”معاف کیجیے گا شاید میری پنل آپ کی میز کے نیچے گر گئی ہے۔“ میں نے سانچو پانزا کے آہنی قد و خال سے نظریں ہٹا کر امریکی لمبہ کی اس ”معاف کیجئے گا“ کی جانب دیکھا۔ درمیانی عمر کی ایک قد سے قبول صورت خاتون ساتھ والی میز پر کنبیاں ٹیکے میری جانب نہایت معصومیت سے ہلکے تکیے جا رہی تھیں۔ میڈرڈ کی طرح جدید، بے جان اور ڈل سا چہرہ۔ مجھ جیسے شرفاء کو پنل گر کر متوجہ کرنے کے طریقہ کار سے میں بخوبی واقف تھا۔ بہر حال میں نے پنل اٹھا کر انھیں تنہا دی۔

”بہت بہت شکریہ“ انھوں نے نہایت بھولپن سے مسکرا کر کہا۔

”یو آر ویکم“ میں نے حسب آداب تکلف برتا۔
 ”اوہ..... اس کی آنکھیں مصنوعی حیرت سے پھیل گئیں۔“ آپ تو انگریزی
 بھی جانتے ہیں؟
 ”جی!“

”بہت خوب! مجھے تو میڈرڈ سے پیار ہو گیا ہے اور آپ کو؟“
 ”نہیں سہرا!“

”اوہ..... آپ نے یہاں کیا کیا دیکھا؟“
 ”الرتیرو۔ پلازا ویل سول دیکھ لیا ہے..... اور یہ پلازا ویل نیپ چونا
 اب دیکھ رہا ہوں۔“

”کیا؟“ ان پر خود ساختہ سکتہ طاری ہو گیا۔ یعنی آپ نے ابھی تک
 پراڈو نہیں دیکھا؟ یا خدا۔ وہ دیکھنے سامنے ہی تو نظر آرہا ہے۔ وہ جس کی
 عمارت کے سامنے گویا کا مجسمہ نظر آرہا ہے۔
 ”گویا کہ.....“

”نہیں نہیں گویا کہ نہیں گویا۔ مشہور ہسپانوی مصور.....“
 ”جس نے ڈچس آف ماچا کی برہنہ تصویر بنائی تھی.....“

”اوہ! یہ تو شہرت ہے!“ انھوں نے استہائی مسرت سے اعلان کر دیا۔
 یہ آخری فقرہ قطعی طور پر خطرے کا الارم تھا۔ چنانچہ میں نے بقیہ
 ہوش اتنا ایک ہی سانس میں ختم کیا اور اٹھ کھڑا ہوا۔ آپ سے مل کر بے حد
 خوشی ہوئی۔ مجھے اس وقت ٹورسٹ آفس سے کچھ معلومات حاصل کرنا ہیں اس
 لیے اجازت دیجئے۔“

”اوہ.....“ انھوں نے فوراً اپنا ٹوکری ٹا پر اٹھایا اور کھڑی ہو
 گئیں۔ ”مجھے بھی اس وقت ٹورسٹ آفس سے.....“

ٹورسٹ آفس میں میں نے کاؤنٹر پر رکھا ایک کتا بچہ اٹھایا اور باہر
 نکل آیا۔ ان محترمہ نے بھی وہی کتا بچہ اٹھایا اور میرے ساتھ ہی چپکی چلی آئیں۔
 ”اب ہم کیا کریں؟“ محترمہ نے ”ہم“ پر یوں زور دیا جیسے ہم ایک مدت سے
 ایک دوسرے کے عشق میں مبتلا چلے آ رہے ہیں۔

”میں سونا چاہتا ہوں“ میڈرڈ کی گرم دوپہر اور محترمہ کے بے جا التفات
 سے بچاؤ کا واحد طریقہ ہوسٹل واپس جا کر آرام کرنا تھا۔

”اوہ! پھر شرارت۔ تم یقیناً اپنا وقت ضائع کرنے میں یقین نہیں رکھتے؟“
 انھوں نے ایک گرمی سانس لے کر پیار سے کہا۔ ”لیکن اس وقت.....
 پراڈو چلتے ہیں!“

ہسپانیہ کے شاہی خاندانوں کو شاید فن مصوری کا اتنا شوق نہ تھا جتنا اپنی
 ذاتی تصاویر بنوانے کا چاہ تھا۔ چنانچہ پراڈو آرٹ گیلری کی دیواروں سے موٹے
 بادشاہ، بدبہشت شہزادیاں اور پستہ قد شہزادے آپ کو حقارت سے گھومتے
 نظر آتے ہیں۔ کارلوس پنجم، فلپ دوم اور فلپ چہارم کی تصاویر کی تو اتنی
 بہتات ہے کہ آنکھیں دکھنے کو آتی ہیں۔ پراڈو دنیا کی دوسری آرٹ گیلریوں
 سے یوں ممتاز ہے کہ اس میں آدیزال قائم شاہکار یا تو نقد رقم ادا کر کے حاصل
 کئے گئے اور یا پھر تھیان، دلاسکر، اور روبنز جیسے شہرہ آفاق مصوروں کو ٹھیکے
 دے کر سینکڑوں کی تعداد میں بنوائے گئے۔ پوئلین کی طرح نہیں کہ یورپ فتح
 کرنے کے بعد ہر شاہکار تصویر پر ”ٹور“ کا ٹھپہ لگایا اور پیرس روانہ کر دی۔
 جہاں اس فن پرستی سے بہت سے مصوروں کا بھلا ہوا ہاں ہسپانوی بادشاہ
 بھی گھاٹے میں نہ رہے۔ فلپ دوم نے دلاسکر سے ایک بڑھیا قسم کی تصویر
 بنا کر ولایت روانہ کی جسے دیکھ کر ایک اڑتیس سالہ نر خیز شہزادی اس بری طرح
 فریفتہ ہوئی کہ ہمیز سے بھرے ہوئے جہاز میں سوار ہو کر خود شادی کرنے

”ادھو ایک دن راستہ میں نوادرات ملتے ہیں“ وہ گھبرا گئیں۔

”ایک دن کے لیے میں نے ضرورت سے زیادہ نوادرات دیکھ لیے ہیں اور ان میں آپ سے ملاقات بھی شامل ہے“

”ادھو..... لیکن ہو سکتا ہے کہ ہمیں وہاں کسی کباڑیے کے سٹور میں سے ان رجن بھر گویا کی تصاویر میں سے ایک ہاتھ لگ جائے جو ۱۸۶۰ء میں پراڈو سے جاری ہو گئی تھیں“

”ہو سکتا ہے“

”پھر؟“ وہ کھل اٹھیں۔

”پھر خدا حافظ مسر..... کیا نام ہے آپ کا؟“

”مس جان ہارڈ۔ آرٹ ٹیچران بائٹن ہائی۔ لیو۔ ایس۔ اے۔ وہ روہانی ہو گئیں۔

”خدا حافظ مس ہارڈ“ میں نے جلدی سے کہا اور پھر چوڑوں کی طرح نظریں نیچی کیے تیزی سے چلتا ہوا پراڈو کے احاطے سے باہر آ گیا۔

مس ہارڈ کے ساتھ میں میڈرڈ کو بھی خدا حافظ کہہ دینا چاہتا تھا اور اب میرا رخ اتو چائٹیشن کی جانب تھا جہاں قرطبہ جانے کے لیے پیشگی ٹکٹ ملتے تھے۔ ایڈرڈ ہٹن نے اپنی کتاب ”ہسپانیہ کے شہر“ میں لکھا ہے ”میڈرڈ کی سڑکیں ناچختہ اور گندی ہیں۔ یہاں کے لوگ منہ پھٹ اور بدتمیز ہیں۔ آب و ہوا ہسپانیہ بھر میں بدترین۔ ایک ایسا شہر جس سے کوئی بھی پیار نہیں کر سکتا“ ہٹن کے آخری فقرے سے میں کئی طور پر متفق ہوں۔ کم از کم میرے اور میڈرڈ کے درمیان کسی قسم کا تعلق پیدا نہیں ہو سکتا تھا۔ برسلز اور فرینکفرٹ کے ہمراہ میں نے میڈرڈ کو بھی یورپ کے ناپسندیدہ شہروں کی فہرست میں شامل کر دیا ہے۔

ہسپانیہ اپنی تین تان، ولاسکزا اور روہنز کے علاوہ پراڈو میں مرلیو، ریشیر اور گویا کی تصاویر بھی دیکھنے میں آتی ہیں۔ روہنز نے متناسب جسم کی تصاویر بنائی ہیں اور حسب عادت رنگ بنائی ہیں۔ یوں لگتا ہے جیسے دو دھیا سنگ مرمر ہو کر جسمانی ابھاروں اور ہیج و خیم میں ڈھل گیا ہے۔ گویا کی بنائی ہوئی سیاہی مائل بلیک گویا“ سیریز کی چودہ تصویریں جنگ کی ہولناکیوں کے خلاف ایک منظور کا احتجاج ہیں۔ ہم پراڈو کے کمرہ نمبر ۱۲ میں گئے جو صرف ولاسکز کے لیے مخصوص ہے۔ ایک محتاط انداز سے کے مطابق اگر اس کمرے میں آویزاں تصاویر کو نیلام کیا جائے تو بارہ ارب روپے سے زائد رقم حاصل ہو سکتی ہے۔

باہر نکلنے سے پیشتر گویا کی دو ماما ”نامی تصاویر بھی سامنے آئیں ایک میں ڈچس آف ماما شریف زادوں کی طرح نیم ڈھکی چھپی صوفے پر نیم دراز۔ دوسری اسی حالت میں مگر بالکل برہنہ۔ ناقدین فن آج تک یہ طے نہیں کر پائے کہ ہر دو تصاویر میں سے کونسی کینز پر پہلے اتری۔ حالانکہ ظاہر ہے برہنہ تصویر بعد میں ہی بنائی جا سکتی ہے۔

ہم پراڈو سے باہر آئے تو لمبے باغ میں بلند ستون پر آویزاں گویا کا مجسمہ دیکھ کر مجھ پر پھر جذباتی ہو گئیں۔ ”ادھو گویا.....“

”گویا کہ“

”یہ تم گویا کو ہمیشہ گویا کہیوں کہتے ہو؟“

”ہاں اے گویا کہ ہی کہتے ہیں“

”اور اب ہم راستہ کی مارکٹ میں چلیں گے“ انھوں نے نہایت بے تکلفی سے اپنا ہاتھ میرے کندھوں پر رکھتے ہوئے اعلان کیا۔

”اور اب ہم یعنی صرف میں واپس ہو سٹل جا رہا ہوں“ میں نے ان کا ہاتھ بصد احترام نیچے کرتے ہوئے کہا ”مجھے صبح قرطبہ جانے کے لیے سامان پیکرنا ہے“

”میں قرطبہ جا رہا ہوں۔“

”قرطبہ؟“ ٹکٹ چیکر نے بے یقینی کے عالم میں میری جانب غور سے دیکھا۔
 لمحہ بھر کے لیے مجھے یوں محسوس ہوا جیسے کہ جسے گا۔ قرطبہ؟ کونسا قرطبہ؟ تم شاید
 تاریخ سے واقف نہیں۔ یوروں کا شہر قرطبہ تو مسٹ بھی چکا۔ وہ چلے گئے اور
 ان کا وجود بھی ختم ہو گیا۔ اب وہاں کھنڈر ہیں۔

”قرطبہ..... میڈرڈ سے..... میل..... ۴۵۷ پیتے نقد..... میں نے
 اس کے ہاتھ سے ٹکٹ لے کر قرطبہ کی مہر پر انگلی جماتے ہوئے وضاحت کی۔
 ”آبا کو رو دبا.....“ چیکر نے زور زور سے سر ہلایا اور اپنے موٹے جُتے کے
 اندر ہی اندر ہنسنے لگا۔ اس کی توند میں پھنسی چمڑے کی کالی پیٹی پٹن کی طرح
 اُگے پیچھے چھک چھک چلنے لگی۔

”آبا کو رو دبا“ میں نے وعشہ زدہ پتیلیوں کے مانند جو آبا سر ہلا کر اُس کی نقل
 اتاری اور پھر قریب آکر نہایت احترام سے کہا ”کو رو دبا نہیں۔ قرطبہ سینیور جی۔
 قرطبہ..... قبتہ الاسلام و مجتمع اعلام الانام۔ ام القرے و قرارة اے الفضل
 والقی۔ ام البلاد..... قرطبہ!“

”پو تر مریم“ چیکر نے فوراً اپنے سر سے اتار کر سینے پر صلیب کا نشان کھینچا
 تجھے موروں سے بچانا۔ اور بڑبڑاتا ہوا اُگے بڑھ گیا۔

قرطبہ میرے لیے اب تک صرف تاریخ کی ضخیم کتابوں میں بکھرے اُن
 سحرانگیز ناموں میں سے ایک تھا جن کے باسے میں یقین نہیں آتا کہ ان شہروں
 کا وجود کبھی تھا یا اب بھی ہے۔ یوں لگتا ہے جیسے ہرات، یار قند، سمرقند، ثرنا،
 بلخ، ختن، قرطبہ، غرناطہ اور اشبیلیہ ایسے نام صرف داستانوں کے لیے ختراع
 کئے گئے۔ ان ناموں کے شہر تاریخ کے صفحات پر اُن نخلستانوں کی طرح ملتے
 ہیں جنہیں کچھ جدید تہذیبیں جکڑے انسان کی آنکھ میں ٹھنڈک کے حشے اُترتے ہیں

قرطبہ - دُور افتادہ

ایک سفید چمکتا گھر۔ روشن صحن میں ایک سانولا لڑکا ہاتھ ہلاتا ہوا پستہ قد،
 زیتون کے چھدے گرد آلود باغ۔ ڈھلوانوں پر سبزے کی ایک تہ کی صورت
 بچھی انگوڑوں کی بلیں قدیم وضع کا ایک رہسٹ جسے ایک قفل قفل کرتا ہوا
 جھینسا تھرختی جھکائے سست روی سے کھینچ رہا تھا۔ پگھلندی پر چلتے ہوئے
 ایک سیاہ پوش پادری نے اپنا ہیٹ اتار کر سر کھلایا اور آنکھیں میچ کر ادھر
 دیکھنے لگا۔ ہریالی سے پرے ایک خشک ٹیلے پر کسی موش قلعے کے شکست
 درو دیوار دکھائی دیے۔ رفتار کا ساتھ نہ دے سکے اور پیچھے رہ گئے۔ ایک اُباڑ
 قصبے کی تنگ گلی میں سے نکلتا ہوا گدھے پر سوار ایک افلاس زدہ بوڑھا شامراہ
 اندلس پر تر بوزلوں سے بھر ایک ٹرک جو ایک عرصے سے اس الیکٹرک ٹیرنڈ لیشنڈ
 ٹرین کے پہلو پہلو جھونتا چلا آ رہا تھا، گھر دوڑ کے کسی بد قسمت گھوڑے کی مانند
 آہستہ آہستہ پیچھے رہ گیا۔ فلش کی تیز روشنی ایسی سفید و صوب اندلس پر اتاری
 ہوئی تھی اور امیر کنڈیشننگ کے باوجود کھڑکی کے دبیز شیشے میں سے اس کی
 مدت سرایت کرتی ہوئی میرے جسم کو چھو رہی تھی۔

”ہلیتے سینیور!“ متحرک نظاروں کا تسلسل یکدم ٹوٹ گیا۔ چیکر میرے سامنے
 ہاں ہاتھ بڑھائے کھڑا تھا جیسے فوراً مجھ سے مصافحہ کر لینا چاہتا ہو۔

”ہی۔ ہاں!“ میں نے سر ہلایا اور پاسپورٹ میں سے ٹکٹ نکال کر اُسے تھا دیا۔

پھول ابھی تک خامین ہیں۔

”کاؤنٹ جوہین مجھے علم ہوا ہے کہ تمہاری افریقی ریاست سیوٹا کے صحرائوں میں
بہت شدت و عقاب پائے جاتے ہیں۔ تم سیوٹا واپسی پر مجھے شکار کے لیے چند
عقاب روانہ کرو۔“

”کاؤنٹ جوہین نے کچھ عرصہ پیشتر اپنی نوجوان بیٹی لڈریق شاہ ہسپانیہ کے
محل میں آداب شاہی کی تعلیم و تربیت کی سفر میں سے بھیجی تھی۔ ایک ندریائے تاج
کے کنارے جوہین کی بیٹی حمام زرید میں غسل کر رہی تھی۔ لڈریق نے اسے دیکھا۔
شاہ مزاج کے مطابق چند لمحوں کے لیے یوں فدا ہوا کہ اس کی عزت پر ہاتھ
ڈال دیا۔ جوہین کو جو شاہ ہسپانیہ کا باجگزار تھا، اپنی بیٹی کی عزت ٹٹ جانے
کا علم ہوا تو فوراً تولید و آن سپنا۔ شاہ کی فرمائش سن کر جوہین نے مسکرا کر کہا۔
”میں وعدہ کرتا ہوں کہ آپ کو افریقہ سے ایسے تند و عقاب روانہ کروں گا جو آپ کے
دہم و گمان میں بھی نہ ہوں گے۔“

اگلے سال ۱۲ء میں کاؤنٹ جوہین کی شکایت پر مسلمان تند و عقابوں کی
طرح ہسپانیہ پر بھڑے اور چشم زدن میں اس کی فضاؤں پر چھا گئے۔ جوہین نے
اپنا وعدہ پورا کر دیا تھا۔

ویسے گہن لڈریق کے ہاتھوں جوہین کی بیٹی فلوریڈا کے ٹھنے کی داستان
کو فرضی قرار دیتا ہے اور اس کی تصدیق ابوالفدا سے ہوتی ہے جو لکھتا ہے
”حضرت عثمانؓ کے زمانے میں بھی عربوں کے جنگی جہاز ساحل اندلس پر حملہ آور
ہوا کرتے تھے۔ کیونکہ وہ ہسپانویوں کو کارہیج کے محاصرے کے دوران میں مدد
کی سزا دینا چاہتے تھے۔“ بہر حال جوہین نے کسی ذاتی عداوت کی بناء پر افریقہ
کے گورنر موسیٰ بن نصیر کو ہسپانیہ پر حملہ آور ہونے کی ترغیب دی۔ موسیٰ نے فضا

اور وہ لمحہ بھر کے لیے اس دنیا کی چوہوں کی دڈرے الگ ہو کر سکون اور آشتی سے آشنا
ہو جاتا ہے۔ ایس پنڈلیسیان الیکٹرڈیکا۔ یعنی برقی ایکسپریس اتو چائٹیشن میڈرڈ
سے آج صبح دس بجے روانہ ہوئی تھی اور اسے پورے تین بجے قرطبہ پہنچ جانا
تھا۔ دو بجے چاہتے تھے اور گھڑی کی سوئیوں کا ایک اور دائرہ مکمل ہونے پر
قرطبہ تاریخ کی قدیم کتابوں کے کرم خوردہ صفحات سے نکل کر میرے سامنے ایک
زندہ حقیقت کی صورت میں ظاہر ہونے کو تھا۔ میرے ذہن میں خوف کے ننھے ننھے
سینور لیے سر اٹھا رہے تھے۔ کیا تاریخ کے صفحوں میں پنہاں یہ نخلستان پیاس کے
اس بھانبر کو بکھا سکے گا جو اوائل عمری سے لے کر اب تک اس شہر اور اس
کی تاریخ نے میرے اندر مچا رکھا ہے۔ دس ہزار میل کی مسافت کی گرد و جو
میرے جسم پر جمی ہے کیا اس کے چشموں میں دھل جائے گی؟..... یا پھر نخلستان
ایک سراب نکلے گا..... چاہتیں منتشر ہو جائیں گی۔ پیاس کی شدت اور سفر کی
دھول سے اٹنے جسم میں اتنی سخت زہر ہے گی کہ وہ دوبارہ کسی نخلستان کی جانب
رشت سفر باز نہ..... میں نے جب ٹکٹ چیکر کو ان طویل القابات کی فہرست
سنائی تھی جن سے تاریخ دانوں نے قرطبہ کو نوازا ہے تو اس نے سینے پر صلیب
بنا کر کہا تھا ”پوٹر مریم۔ مجھے مژدوں سے بچانا۔“ یہ کیسا خوف ہے جو مژدوں کی آخری
سلطنت غرناطہ کے زوال کے ۴۴ برس بعد بھی ہسپانوی ذہن پر سوار ہے یا پھر
یہ خوف اس لاشعور کو دبانے کی ایک شعوری کوشش ہے جو ہر لحظہ ذہن کے
سناں خانوں میں اٹھیں اپنی ذات کی نفی کرنے کے عمل سے روکتا ہے۔ تم اپنے
آباد و اجداد سے کیسے من موڑ سکتے ہو؟ تمہاری شریاؤں میں عرب اور بربر خون
ہمک رہا ہے۔ تمہارے بیشتر شہروں اور دریاؤں کے نام عربی میں ہیں۔ بولبرو کی
تانوں کے ہمراہ گیار کی سنگت نہ ہو تو اذان کی لے لگتی ہے۔ تم کوئی کام شروع
کرنے سے پیشتر اوجا لہہ کہتے ہو جو دراصل انشاء اللہ ہے۔ اور تو اور یاسمین کے

کوسازگار پایا مگر مھر پور حملے سے پیشتر خلیفہ ولید سے اجازت طلب کی۔ ولید نے پیغام بھیجا۔ باقاعدہ حملے سے پہلے ایک چھوٹا سا دستہ اندلس روانہ کر دیا تاکہ ہمیں ہسپانویوں کی اصل قوت کا اندازہ ہو سکے۔ یہی مسلمانوں کی بڑی تعداد کو طوفانی سمندر کے رحم و کرم پر نہیں چھوڑنا چاہتا۔

عرب صحرائشین ہونے کے ناتے سے ہمیشہ سمندر سے خوف زدہ رہے اور یہ ترک ہی تھے جنہوں نے بعد میں یورپ کے اس مفروضے کو جرّے سے اٹھاڑ پھینکا کہ تمام مسلمان سمندر سے غائف ہیں۔ ولید کے حکم کے مطابق موسیٰ نے ۷۱۱ء میں طریف نامی ایک آزاد غلام کو چار سو افریقی پیدل سپاہ اور ایک سو عرب گھڑ سواروں کی کمان سے کر چار بحری جہازوں میں اندلس کی جانب روانہ کیا۔ طریف ساحل پر لنگر انداز ہوا اور اس کی مختصر فوج خشکی پر اٹھا رہیل اندر تک بلا مقابلہ چلی گئی۔ ساحل اندلس پر آج بھی وہ مقام طاریف کہلاتا ہے جہاں تقریباً ساڑھے بارہ برس پہلے اس نام کے ایک آزاد غلام نے قدم رکھ کر مسلمان ہسپانیہ کی بنیاد کی پتلی اینٹ رکھی۔ طریف کی انتہائی کامیاب مہم نے موسیٰ بن نصیر کو مطمئن کر دیا اور وہ اندلس پر ایک باقاعدہ اور بڑے حملے کا منصوبہ بنانے لگا۔ پورا سال طنجہ کی بندرگاہ میں اس مہم کے لیے جنگی جہاز بننے رہے اور موسیٰ اپنے محل میں اندلس کا نقشہ سامنے پھیلائے جنگی منصوبہ بندی میں مگن رہا۔ اگلے سال کے موسم بہار میں موسیٰ کے سپہ سالار طارق بن زیاد نے پانچ ہزار سپاہ کی معیت میں افریقہ اور یورپ کے بڑے اعظموں کے درمیان حامل مختصر سمندری فاصلے کو جہازوں پر عبور کیا اس لیے نام چٹان کے پہلو میں لنگر انداز ہوا جس نے بعد میں اُس کا نام پایا اور جبل الطارق کہلائی۔ کہتے ہیں جب طارق کے جہاز طنجہ سے چلے تو ساحل پر کھڑے سینکڑوں بربر جوش میں آکر سمندر میں کود پڑے اور تیرتے ہوئے جہازوں میں جا سوار ہوئے۔ تاریخی دان گبن ساحل اندلس پر

آخری جنگ کے جائے وقوعہ کے بارے میں تاریخ دانوں میں اختلاف برائے ہے۔ بیشتر عرب تاریخوں میں اسے وادی برباط میں جھیل لاجنڈا کے کنارے بتایا گیا ہے۔ لیکن گبن کہتا ہے کہ یہ جنگ قادس کے قصبے کے فواح میں شریس کے اُس پاس لڑی گئی۔ اسی مقام پر طارق نے اپنی سپاہ سے خطاب کرتے ہوئے کہا: میرے بھائیو دشمن تمہارے سامنے سے اور سمندر تمہارے عقب میں۔ کہاں جاؤ گے؟ اپنے قائد کے پیچھے چلے آؤ کیونکہ میں نے عہد کر لیا ہے کہ یا تو جان سے دوں گا اور یا ہسپانویوں کو مسل کر رکھ دوں گا۔ قاضی ولی محمد نے اس تقریر کا حوالہ دیتے وقت "سمندر تمہارے عقب میں" کی بجائے "جھیل تمہارے عقب میں" لکھا ہے جس سے اس رائے کو تقویت ملتی ہے کہ جنگ جھیل لاجنڈا کے کنارے ہی لڑی گئی۔ تین دن تک افریقین میں چھوٹی موٹی جھڑپیں ہوتی رہیں اور چوتھے روز ۱۹ جولائی ۷۱۱ء کو باقاعدہ جنگ شروع ہو گئی۔ لذریق ہاتھی دانت کی بنی ہوئی رتھ پر سوار میدان میں آیا جسے دو سفید خچر کھینچ رہے تھے۔ قلیل تعداد میں ہونے کے باوجود مسلمانوں کے حملے میں اتنی شدت تھی کہ ہسپانویوں کے قدم اکھڑنے لگے۔ موتیوں کی لڑیاں سر پر پیٹھے، ریشم کے سنہری لباس میں ملبوس

لذریق یقیناً اُس وقت کو کوس رہا تھا جب اُس نے تند و خمرائی عقابوں کی خواہش کی تھی جب شکست یقین کی سرحدوں کو چھونے لگی تو لذریق شاہی رتھ سے اتر اڑا اور یلیا نامی سفید گھوڑے پر سوار ہو کر میدان جنگ سے بھاگ نکلا۔ بقول بگن وہ ایک بہادر کی موت مرنے کی بجائے وادی الکبیر کے پانیوں میں ڈوب مرا۔ ہسپانیوں کا عقیدہ ہے کہ وہ ایک غار میں گوشہ نشین ہو گیا اور باقی عمر عبادت میں گزار دی۔ پادری کہتے ہیں کہ کافروں سے شکست کھانے کی سزا میں اُسے خدانے ناگوں سے ریگتے ہوئے ایک ایسے گڑھے میں ڈال دیا جہاں وہ چلا چلا کر فریاد کرتا تھا: "ناگنیں میرے جسم کے اس حصے کو ٹھپ کر رہی ہیں جس کی مدد سے میں نے تمام تر گناہ کیے" اور ایک مسلمان تاریخ دان ابن اہمر نے لذریق کے انجام کے بارے میں لکھا ہے: "گو تھوں کے بادشاہ لذریق کا سفید گھوڑا دلدل میں چسنا کھڑا تھا۔ بہیروں سے جڑی کاٹھی پر لبادہ شاہی رکھا تھا۔ کچھ ناصیے پر اس کا ایک جوتا اور ایک طلائی لباس پڑا تھا، وہ یا تو مارا گیا یا فرار ہو گیا"۔

لذریق سا پہاڑ اتنے سے ہٹا تو طارق کو گویا پورا ہسپانیہ ایک وسیع میدان کی صورت نظر آیا جہاں کہیں کہیں شہری ریاستوں کے ٹیلے ابھرتے تھے مگر بیشتر حصہ پاٹ اور رکاوٹوں سے مبرا تھا۔ اس نے فوج کو چار حصوں میں تقسیم کیا۔ ایک حصہ آرکی ڈونا کی طرف۔ دوسرا البورایعینی وادی غرناطہ کی جانب۔ اکتیسویں فوج کی قیادت میں قرطبہ روانہ کیا گیا اور بقیہ فوج کے ہمراہ طارق خود تولیڈ کی طرف بڑھا۔

اختیاط پسند موسیٰ کو جب طارق کی مسلسل کامیابیوں کی خبریں موصول ہوئیں تو اُس نے اپنے جرنیل کو مزید پیش قدمی کرنے سے روک دیا۔ کچھ لوگ اس نامناسب حکم میں موسیٰ کا جذبہ حسد پنہاں دیکھتے ہیں۔ ادھر موسیٰ کے احکام کی خلاف ورزی

کرتے ہوئے طارق کی سپاہ نے اپنے گھوڑوں کی باگیں بدستور ڈھیلی چھوڑے رکھیں۔ یہاں تک کہ گرمیوں کے آخر نے انہیں ہسپانیہ کے دوسرے سرے پر واقع تولیڈ کی فصیلوں کے سائے تلے دیکھا۔ اس اثناء میں موسیٰ نے اپنے نافرمان جرنیل کا پیچھا کرنے کی ٹھانی اور جون ۱۲ء میں افریقہ کی گورنری اپنے سب سے بڑے بیٹے کو سونپ کر دس ہزار شاہمیوں اور آٹھ ہزار بربروں کی قیادت میں ہسپانیہ کے ساحل پر اتر آ۔ طارق کے چھوٹے ہوئے شہروں قرموزہ اور اشبیلیہ کو روندنا گلیشیا اور لیون کے پہاڑوں کو عبور کرتا وہ تولیڈ پہنچا۔ اس نے طارق کو حکم عدولی کی بناء پر چابک سے پٹیا اور فی الفور معزول کر دیا۔ اب موسیٰ کا ارادہ تھا کہ وہ کوہ پیرانیز عبور کر کے اطالیہ، فرانس اور جرمنی کو زیر کرے، پھر مغرب کے کناسے کناسے پیش قدمی کرتا ہوا بحیرہ اسود تک جا پہنچے اور قسطنطنیہ ختم کرنے کے بعد سیدھا شام میں خلیفہ ولید کے دربار میں پیش ہو کر اپنی فتوحات کو ایک نیم دائرے پر محیط کر لے جس میں تقریباً پورا یورپ اور ایشیائے کوچک شامل تھا مگر طارق کے چند ساتھی دمشق پہنچ گئے اور انھوں نے اپنے سپہ سالار کی معزولی کو بنیاد بنا کر خلیفہ ولید کو موسیٰ کے خلاف بھڑکا دیا۔ لوگ اسے مقام پر خلیفہ کے ناصد نے موسیٰ کو جالیا اور اس کے گھوڑے کی باگ پکڑ کر واپسی کا حکم سنایا۔ موسیٰ یورپ فتح کرنے کی حسرت دل میں لیے واپس دمشق لوٹا مگر اس شان و شوکت کے ساتھ کہ اس کے گھوڑے کے پیچھے چار سو ہسپانوی شہزادے تاج پہنے چل رہے ہیں۔ شاہزادہ لباس میں سینکڑوں شہزادیاں پالکیوں میں سوار ہیں اور چالیس ہزار سفید غلام مالی غنیمت اٹھائے چلے آ رہے ہیں۔ یہ بے مثال جلوس فلسطین پہنچا تو ایک ناصد خلیفہ ولید کی شدید علالت کی خبر لے کر آیا۔ ساتھ ہی ولید کے بھائی سلیمان کا پیغام آیا کہ جلوس فلسطین میں ہی روک دیا جائے تا آنکہ ولید فوت ہو جائے اور اس کی جگہ سلیمان تخت نشین ہو جائے۔ یوں سلیمان اس فاسخ جلسہ کا استقبال

کر کے اندلس کی فتح کا سراپہ بنے سر باندھا چاہتا تھا۔

اس نقطے پر موسیٰ کا مستقبل تابیت سے دامن چھڑا کر قسمت کے ہاتھوں میں چلا گیا۔ اُس کے لیے فوراً رُک جانا یا دمشق کی طرف بڑھنا یکساں پر از خطر تھا۔ رُکنے کی صورت میں ولید خلاف توقع صحت مند ہو جائے تو سازش کا جرم اور اگر بدستور دمشق کی جانب گامزن رہے تو ولید کی موت کی صورت میں خلیفہ سلیمان کے قہر کا سامنا کرے۔ اس نے حال کی حکمرانی پر بھروسہ کیا اور رُک کے بغیر آگے بڑھا۔ فروری ۱۵۱ء میں فاتح اندلس دمشق میں داخل ہوا اور اس کا استقبال مسجد اُمیہ کی وسیع عمارت میں کیا گیا۔ سینکڑوں تاجداران یورپ سرنگوں ہو کر خلیفہ کے حضور آداب بجالائے۔ کہتے ہیں اس موقع پر موسیٰ نے دوسرے مال غنیمت کے علاوہ خلیفہ کی خدمت میں وہ تاریخی میز بھی پیش کی جس کے بارے میں روایت ہے کہ اسے حضرت سلیمان کے چٹوں نے تخلیق کیا تھا۔ اسی نسبت سے یہ سلیمان کی میز کہلاتی۔ بیت المقدس کی فتح کے بعد رومی اس میز کو یورپ لے آئے اور بعد ازاں یہ گوشتک بادشاہوں کے ہاتھ لگی۔ عاقبت سوار نے کے لالچ میں یکے بعد دیگرے درجنوں بادشاہوں نے اسے جو اہرات سے سجایا۔ مسلمانوں کے حملے کے وقت یہ میز تولید کے کلیسا اعظم میں دھری تھی۔ طارق نے اُسے ایک فرار ہوتے ہوئے راب سے چھینا تھا جس نے یہ میز اپنے لباس میں چھپا رکھی تھی۔ ایک روایت کے مطابق اس کے تین سو ساٹھ پائے تھے اور جس وقت موسیٰ نے اُسے خلیفہ کے حضور پیش کیا تو ان میں سے ایک موجود نہ تھا طارق نے اس موقع پر آگے بڑھ کر وہ ایک پلایہ اپنے لباس میں سے نکال کر میز پر رکھ دیا اور یوں ثابت کر دیا کہ اندلس کا اصل فاتح وہ ہے نہ کہ موسیٰ بن نصیر۔ خلیفہ نے جب اندلس کے اپنی آسانی سے فتح ہو جانے کا سبب دریافت کیا تو موسیٰ نے جواب دیا "وہاں کے شہزادوں کی نامردی" لیکن یہ جواب اس نے خلیفہ ولید کو نہیں دیا تھا کیونکہ اس

کی جگہ اب خلیفہ سلیمان تخت نشین تھا۔ موسیٰ کا شاندار استقبال اس بات کی ہرگز دلیل نہ تھا کہ سلیمان اس کی حکم عدولی مجھلا بیٹھا ہے بلکہ اس نے تو صرف اب تک بڑھے موسیٰ کو اس تاریخی کھیل میں مرکزی کردار ادا کرنے کی اجازت دی جب تک کہ فتح اندلس کی شہرت اس کے نام منتقل ہو کر تاریخ کے صفحوں پر نہ اتر گئی۔ یہ کھیل ختم ہوا تو اسے موجودہ حکومت کی حکم عدولی کے الزام میں عدالت میں پیش کیا گیا۔ دولاکھ درہم جرمانے کے علاوہ تمام جائیداد چھین لی گئی۔ کل مراعات سے محروم کر دیا گیا اور پھر برسر عام کوڑے لگانے کے بعد شاہی محل کے باہر تہتی دھوپ میں ایک ستون سے باندھ دیا گیا۔ جرم تھا "دروغ گوئی اور اناؤں فرود تو ایک معجزے سے سرور ہو گئی، مگر اس کے بعد مطلق الغنان حکمرانوں کی آتش نظام کو ٹھنڈا کرنے کے لیے شاید خدا کے پاس بھی کوئی معجزہ باقی نہیں رہا۔ سلیمان بھی آدمی دنیا کا حکمران تھا۔ وہ مہندی سے سرخ کی ہوئی لمبی داڑھی والے عمر رسیدہ موسیٰ کو ذلت کے عمیق گڑھوں میں دھکیلنے کے باوجود مطمئن نہ ہوا۔ اور اس نے اشبیلیہ کے گورنر موسیٰ کے بیٹے عبدالعزیز کو قرطبہ میں ترسیخ کروا دیا۔ جلا دینے عبدالعزیز کا سر ایک طشتری میں سجا کر موسیٰ کے سامنے دکھا دیا پوچھا کیا تم ایک باغی کے خدو خال پہچان رہے ہو؟ موسیٰ نے جواب دیا "میں صرف اپنے بیٹے کے خدو خال پہچان رہا ہوں" بالآخر موسیٰ کا بڑھاپا اور اُس کی حرماں نصیبی اُسے بادشاہوں کے غیظ و غضب سے بلند لے گئے اور وہ چند برس بعد کچھ میں فوت ہو گیا۔ تاریخ دان مقرر نے لکھا ہے کہ آخری مرتبہ فاتح اندلس موسیٰ بن نصیر کو وادی القراء (حجاز) کے ایک چھوٹے سے گاؤں میں بھیک مانگتے دیکھا گیا تھا۔

ایک انجرا ہوا باغ۔ بیچ میں ایک شکستہ گزائیں جیسے صدیوں سے سوکھا پڑا ہو۔

ایشیوں اور اُدھر کبھری پڑی تھیں خشک رویشیں، پڑمردہ کیا بیاں، بچول کھائے ہوئے۔
پتوں سے عاری ٹنڈ منڈ بیلوں کی شاخیں کسی لاغر کی پسلیوں کی مانند قدیم دیواروں
سے چمٹی ہوئی۔ گاڑی آہستہ ہوتی جا رہی تھی۔ پھر نیلے آسمان کو ایک ٹیٹ فارم کی مین
کی چھت نے چھیدا اور ڈھانپ لیا۔ چھت سے ایک چھوٹا سا بورڈ جھوٹا نظر آیا۔
”کا رو دوبا“۔

قرطبہ! مغیث رومی نے انجیر کے ایک درخت پر چڑھ کر اپنا عالمہ فصیل پر
پھینکا اور اس کی مدد سے شہر کے اندر کود گیا۔ پہلے مسلمان فاتح کی حیثیت سے۔
میں اپنا ٹرک سیک اٹھا کر اس کے ٹیٹ فارم پر اُترا۔ ایک سیاح کے طور پر!
اس بزرگ شہر کا سٹیشن کالا شاہ کا کو سے بھی گیا گزرا تھا۔ کہیں یہ نخلستان سراب ہی
نہ ہو؟ دل نے دھک سے دھائی دی۔ میں دیر تک باہر جانے کے راستے سے
منہ موڑے چھت سے ٹنگے بورڈ پر کھسے سات لفظوں کے مجموعی تاثر کو اپنی
پیاسی آنکھوں میں سمونارہا۔ ”کا رو دوبا“ یہاں تک کہ گاڑی کے ڈبے آپس میں
بھڑے۔ حرکت میں آئے اور ”کا رو دوبا“ کے بورڈ کے نیچے سے سرکتے سرکتے چپٹا
سے نکل گئے۔

یورپ میں ایک رسم بلائٹ ڈیٹ نام کی ہے۔ آپ کے کسی دوست کی گرل فرینڈ
آپ کو اکیلا پا کر (دوست بھی ساتھ ہوتا ہے) سر سے پاؤں تک آپ کا تفصیلی
جائزہ لے کر سوچے گی: ”ان دنوں میری سہیلی ایبلا بھی بالکل بے کار ہے کیوں
ان دنوں کا تعارف کروا دیا جائے؟“ چنانچہ وہ اس کی خوبصورتی اور شہت مذاق
کی تعریف میں زمین و آسمان کے قلابے ملا دے گی اور اسی انداز میں اپنی سہیلی
کے سامنے آپ کی وجاہت کی داستانیں سنا کر اگلی مرتبہ اس بی بی کو بھی ہر لے
آئے گی۔ ویسے یہ دوسری ترغیب سراسر رسمی ہوتی ہے۔ ورنہ فریقین اپنی
اپنی صنعت کے مطابق ”سکرٹ میں ہوا“ کچھ بھی ہوا اور پتلون پہنے! کوئی بھی جاندار

کے مغولے پر یقین رکھتے ہیں۔ بہر حال اس اُن دیکھی بی بی کے ساتھ آپ کا تعارف
کروا دیا جاتا ہے اور باقی معاملہ ہمت مردان یا سوڈش لڑکی کی صورت میں ہمت
عورتاں پر چھوڑ دیا جاتا ہے۔ اس انجانی ملاقات کا نام بلائٹ ڈیٹ ہے۔ یعنی
آنکھیں بند کر کے بحرِ رومان میں آنکھیں بند کر کے کود پڑنے کا نام۔ صرف کوفنے کے
بعد ہی پانی کی گھرائی کا اندازہ ہوتا ہے۔ کچھ اسی طور قرطبہ کے ساتھ بھی
آج میری بلائٹ ڈیٹ تھی۔ تاریخی کتابوں نے مسیح میکرز کا فرض سر انجام دیتے
ہوئے اُس کے حُسن کے تذکروں سے مجھے بے چین کر دیا تھا۔ لیکن قابلِ فہم طور
پر اس پہلی ملاقات کے موقع پر میرے دل میں کھد بدمچی تھی۔ میں سٹیشن سے
باہر قدم رکھنے سے ہچکچا رہا تھا۔ جانے یہ خاتون میری توقعات پر پوری اُترتی
ہے یا مجھ غریب کو خواہ مخواہ پھانس لیا گیا ہے۔ میں نے بگنگ کھوک سے ٹورسٹ
آفس کا پتہ دریافت کیا اور جھجکتا ہوا پہلی ملاقات کے لیے سٹیشن سے
باہر آ گیا۔

”خاتون سے اگر کتور نامی ایک خشک اور بے ربط بارغ سے بائیں ہاتھ پر
کالیے جنرل ازمو کی سڑک تھی اور اس کے ساتھ کالیے گراں کاپی تان کی شاہراہ
شروع ہوتی تھی۔ وہی جدید وکانیں۔ جہازی ہوٹل۔ نیون سائن، ٹریفک سگنل،
لاٹری کے محٹ بیچنے والے بوڑھے۔ قرطبہ بھی میڈرڈ کا چھوٹا بھائی لگ رہا تھا۔
یہ تو وہی عام سا شہر ہے۔ میرا دل ڈوبنے لگا۔ بلائٹ ڈیٹ بالکل بلائٹ تھی۔

ایک قہر خانے کے دیشرے ٹورسٹ آفس کا راستہ دریافت کیا تو وہ جھاڑن
کانڈے پر ڈال کر میرے ساتھ ہو لیا۔ ٹورسٹ آفس بند تھا۔ شیشے کے دروازے
کے اندر ایک تختی تلک دی تھی جس پر کچھ ہندسے درج تھے۔ دیشر نے پچلا جیڑا
کیچ کر منہ لمبا کیا اور کھلی ہتھیلی پر سر رکھ کر آنکھیں جھپکانے لگا یعنی بند ہے قہر خانے
کے لیے۔

مہربان و میٹر کا شکریہ ادا کرنے کے بعد میں وہیں فٹ پاتھ پر اپنے رُک سیک سے ٹیک لگا کر نیم دراز ہو گیا اور اپنی آنکھوں کے سامنے متحرک اجسام کا جائزہ لینے لگا۔ نیم درازی کی اس سطح سے سب سے پہلے شہر کے باشندوں خصوصاً خواتین کی ٹانگوں کی بناوٹ سامنے آتی ہے۔ پھر نظر اوپر اٹھتی ہے تو جسم کے بقیہ خطوط کا حجم آشکارا ہوتا ہے۔ قمر طبن دوشیزاؤں پر زیتون کے تیل اور پائیلیا یعنی چڑو کے اثرات نمایاں تھے۔ پنگ کے پائیوں ایسی موٹی اور گھسیٹا ٹانگیں چھوٹے قد اور چشم غزال بھی کچھ اتنی عام نہ تھیں کبھی میں دکانوں پر آویزاں بورڈ پڑھنے لگتا، مفہوم تو سمجھ میں نہ آتا البتہ ان کے نیچے کار دو با دیکھ کر عجیب سا سکون محسوس ہوتا۔ ٹورسٹ آفس کے پہلو میں ایک فٹ پاتھ تھی قمرہ خانہ قاج کی ایک میز پر بیٹھا کوئی غیر ملکی جوڑا کافی کے ہر گھونٹ کے بعد یہ لازم سمجھتا کہ لبوں کے ذریعے ایک دوسرے کے گالوں کا درجہ حرارت معلوم کیا جائے۔ ان کے سامنے دو قمر طبنیں چہروں کے آگے ہسپانوی کچھ پھیلائے انھیں بڑے غور سے دیکھ رہی تھیں۔ میں صرف ان کی سرے سے بھری آنکھوں کے پھیلنے اور سکڑنے سے اندازہ لگا لیتا کہ اب غیر ملکی جوڑا کافی پینے میں مشغول ہے یا صرف مشغول ہے بعض اوقات ان کی آنکھیں مزید پھیلنے سے انکار کرتی تھیں تو وہ جھٹ سے میز پر دھرا شراب کا گلاس اٹھا کر حلق میں انڈیل لیتیں۔

”ہیلو“ میں نے قمرہ خانے کے میٹر کو پکارا جو پچھلے پندرہ منٹ سے ہاتھ میں ایک شستری لیے میری طرح فٹ پاتھ پر سے گزرنے والی نسوانی مخلوق کو بنظر غور دیکھ رہا تھا۔ اس نے بے یقینی کے عالم میں میری جانب مڑ کر دیکھا تو میں نے آنکھ میچ کر اسے اپنی طرف آنے کا اشارہ کر دیا۔

”ہی سینور!“ میٹر کو میرے لبوں پر آنے کے لیے خاصا جھکنا پڑا۔
”ایک ہورشا تا دی شوفا“

”میں فٹ پاتھ پر؟“ اس نے مسکرا کر دریافت کیا۔
”کیا حرج ہے؟“ میں نے ہاتھ پھیلا کر کہا۔
میٹر میری اس شان فیکری سے بے حد متاثر ہوا اور اپنی شستری دُف کی مانند بجاتا ہوا قمرہ خانہ کے اندر سے ایک ہورشا تالے آیا۔
”میں پسیتے“ اس نے گلاس مجھے تھمانے سے پیشتر شستری میں رکھا بل آگے کر دیا۔

ہورشا تالے کے ناریل سے دودھ کا ایک گھونٹ بھر کے میں پھر اہل تسر طبع کی جانب بلک لیں کہنا چاہیے کہ ان کے جسموں کے زیریں حصوں کی جانب متوجہ ہو گیا۔

”سینور کیا آپ میرا انتظار کر رہے ہیں؟“ ایک خوش مزاج بڑی بڑی آنکھوں والی لڑکی منی سکرٹ کو گھٹنوں تک کھینچتی میرے پاس آ بیٹھی۔
”پلائنڈ ڈیٹ؟“ میں نے سوچا۔ اللہ میاں جب دیتا ہے پتھر پھاڑ کر دیتا ہے اور یہاں تو چشم غزال بھی عام تھی۔

”ہورشا تا پیجئے گا؟“ میں نے خوش دلی سے دعوت دی۔

”نو“ ہر دو چشم غزال بڑے تباہ کن انداز میں جھپکیں۔ اس نے اپنی کٹنیاں منی سکرٹ میں سے دھیرے دھیرے پھسلتے گھٹنوں پر جمائیں اور دودھ دھیا باہر لے کر ایک سفید فریم کی مانند اس کے خوبصورت چہرے کا احاطہ کر لیا۔

”ماما میا“ میرے منہ سے بے اختیار ایک ایسا فقرہ ادا ہو گیا جو ایسا ہی خوبصورت چہرہ دیکھنے کے فوراً بعد اطالوی نوجوان مصنوعی طور پر بے ہوش ہو جانے سے قبل ہاتھ ہلا کر بولتا ہے۔ پنجابی میں اسے ”ہائے نیس میریے مائے“ کہہ لیجئے۔

”تو پھر اگر آپ کو فرصت ہو تو آج شام.....“ میں نے ملاقات کے لیے

والی باد نسیم کا پہلا جھونکا۔ یعنی راجشاہ اور گراں کاپی تاں اور کالیے جنرل ازمو
دغیرہ ہیں تو یہ.....“

”یہ تو جدید قرطبہ سے..... اور کچھ؟“

”ہاں دوچار روز قیام کا ارادہ ہے۔ اگر عہد قدیم کی کوئی کارروان سرانے
ابھی تک شہر میں موجود ہو تو اس کا پتہ بتا دیجئے..... شرط یہ ہے کہ وہاں اونٹ
باندھنے کا تسلی بخش انتظام ہونا چاہیے۔“

”اونٹ؟ اس کی آنکھیں مزید پھیلیں اور گردن لمبی ہو گئی کیونکہ وہ غلوک
ننگنے کی کوشش میں مصروف تھی۔“

”ہاں ہاں اونٹ سٹیشن پر ہی چھوڑ آیا ہوں۔“

”یو جوک؟ چشم غزال نے بے دلی سے پوچھا۔“

”ییس آئی جوک..... بہر حال چند روز کے لیے کسی سستی رہائش کا
متلاشی ہوں۔“

”بو نمو“ وہ یوں کھلکھلا کر ہنسی کہ میرے اندر کا سیاح ڈالواں ڈول ہوا
اور ڈان ڈوان اُسے دھوبی پٹرا سے کراس کے سینے پر سوار ہو گیا۔ ”مامامیا“

کے منزعہ الفاظ کی ادائیگی سے وہ پھر سنجیدہ ہو گئی اور اس نے بے حد سرکاری
انداز میں مجھے شہر کے متعدد پانسیاں اور ہوٹلوں کے پتے بتانے شروع کر دیے۔

”پانساں ال کاندے..... پچاس پستے! ہوٹل ٹوریو ڈور.....“

وہ کسی ہوٹل یا پانسیاں کا نام دہرے پڑھتی اور پھر گردن میں خم دے کر میری

جانب یوں دیکھتی جیسے نکاح خواں منظوری کی اجازت چاہتا ہو میں بلا سچے سچے

اسے مہنگا قرار دے کر انکار میں سر ہلا دیتا۔ اس پر چشم غزال اونہہ کر کے منہ کچھ

یوں کیڑتی کہ جیسے اس نے کوئی ایسی نتھ پہن رکھی ہے جو تنگ ہونے کی

وجہ سے اُسے زبردست کھجلی کر رہی ہے۔ ہوٹلوں کے کرائے گراں تو کجا دیگر

نمید باندھی ہی تھی کہ وہ فوراً اٹھ کھڑی ہوئی اور قد سے بے رخی سے کہنے لگی۔ ”سینو میں
ٹورسٹ آفیسر ہوں۔ آپ کو آفس کے سامنے فٹ پاتھ پر یوں لیٹا دیکھ کر جان گئی تھی
کہ میرا ہی انتظار کر رہے ہیں..... آئیے دفتر کے اندر چلتے ہیں۔“

چمکتی دوپہر میں میری اُمیدوں پر اوس پڑ گئی۔ چھپڑاپنی جگہ موجود قائم و دائم
تھا۔ اللہ میاں فی الحال اسے پھاڑنے کا ارادہ نہیں رکھتا تھا۔

”مرکزیتا کی تھڈل صبح آٹھ بجے سے ڈیڑھ بجے تک اور پھر پانچ بجے سے
ساٹھ سات بجے تک سیاحوں کے لیے کھلتا ہے۔ اس نے دفتر کا دروازہ کھولتے

ہوئے اطلاع فراہم کی۔“

”مرکزیتا کی تھڈل؟“ میں رُک سیکھ گئی اُس کے پیچھے چلا آیا۔

”آپ مسجد قرطبہ کہہ لیں..... میں جانتی ہوں کہ اکثر مشرقی سیاح قرطبہ

صرف اس مسجد کی خاطر آتے ہیں۔“

”مسجد کے علاوہ قرطبہ میں اور کون کون سی قابل دید تاریخی عمارتیں ہیں۔؟“

ڈان ڈوان کا لبادہ اتار کر میں نے ایک طرف رکھ دیا اور ایک مرتبہ پھر سیاح کے
روپ میں آگیا۔

”میں یہ بھی جانتی ہوں کہ قابل دید تاریخی عمارتوں سے متحاری مراد صرف

مُورش عمارتیں ہیں۔ میری سابقہ لیڈی نے چند سیاحتی کتابچے کاؤنٹر سے اٹھا کر

میرے حوالے کر دیئے۔ شہر سے باہر میرا مورنیو کے وامن میں مدینۃ الزہرا کے

کھنڈرات ہیں۔ وہاں بس نہیں جاتی ٹیکسی آنے جانے کے دوپٹے لے گی۔

وادی الکبیر کی مُورش پن چکیاں اور رومی پُل..... مٹھائے لیے عرب پُل القصر اور

پُرانے حماموں کے کھنڈر۔ قدیم فصیل شہر کے دروازے اور عربوں کے زمانے کا

قدیم قرطبہ جو بصورت ترین حصہ ہے۔“

”عربوں کے زمانے کا قرطبہ..... میں سنبھل کر بیٹھ گیا۔ نخلستان سے آنے

سے ایسے نہ تھے۔ یونانی فلسفہ، موسیقی، علم حساب، علم بدن اور دیگر بے شمار علوم ہمیں نے یورپ کو عطا کیے اور پھر میں سال میں ایک مرتبہ جمعہ کی نماز مسجد قرطبہ میں منور اور اکر تا ہوں۔

”مجھے تو بتایا گیا تھا کہ مسجد میں نماز ادا کرنے کی اجازت نہیں۔“

”مختلفی طور پر شاید ہو مگر مجھے تو پچھلے دس برس سے کسی نے نہیں روکا۔ اور پھر ہسپانوی حکومت بھی تو اسے مزید کتنا قدرتی یعنی مسجد کلیسا کا نام دیتی ہے۔ اگر کلیسا میں عبادت ہو سکتی ہے تو مسجد میں نماز پڑھنے پر کیسے پابندی عاید کی جا سکتی ہے۔“

کتنی عجیب بات ہے کہ جس ملک پر عربوں نے پونے آٹھ سو برس حکومت کی آج وہاں.....

”منیں..... تم مجھوتے ہو مستنصر حسن نے سنجیدگی سے کہا۔“ تمہیں تو ان متعصب ملاؤں کی طرح بات نہیں کرنی چاہیے جو منبر پر چڑھ کر بڑی رعونت سے اعلان کرتے ہیں کہ ہم نے اتنے سو برس اندلس پر حکومت کی اور اندلس ہماری جاگیر تھا..... منیں ایسا ہرگز نہیں تھا، ہم نے یہاں کبھی بھی حکومت نہیں کی اس لیے کہ ہم تو خود یہاں کے رہنے والے تھے۔ یہ ملک ہمارا تھا۔ بھلا اپنے آپ پر بھی کوئی حکومت کرتا ہے؟ عربوں کی آمد کے ایک سو برس کے اندر اندر باہمی میل جول اور شادیوں کے نتیجے میں پورے ہسپانیہ میں ایک ایسی نسل وجود میں آئی جن کی رگوں میں یورپی، عرب اور افریقی خون دوڑ رہا تھا اور یہ سب کے سب مسلمان تھے۔ اندلسی مسلمان..... اسی مخلوط نسل نے اندلس پر حکومت کی۔ ایک دور تو ایسا آیا کہ بیشتر خلیفوں کے بال اور داڑھیاں سنہری رنگ کے تھے اور عرب دکھانی دینے کے شوق میں انھیں خضاب سے سیاہ کرتے تھے۔ خلیفہ الناصر نے ایک مرتبہ جب شجرہ نسب دیکھ کر اپنے جسم میں

آباد اجداد کے خون کا تناسب جاننا چاہا تو معلوم ہوا کہ اس کی رگوں میں صرف ایک فیصد عرب خون کی آمیزش ہے اور بقیہ ننانوے فیصد مخلوط ہے چنانچہ جب شمال کے عیسائیوں نے مسلمان اندلس کا پہلا شہر فتح کیا تو ان کی امیدوں کے برعکس اندلسی مسلمان عرب یا بربر نژاد نہ تھے بلکہ مسجدوں میں نماز ادا کرنے والوں کی صفوں میں اُسنی جیسے سُرخ و سفید سنہری بالوں والے یورپی کھڑے تھے۔ حسن اگرچہ پیشے کے لحاظ سے وکیل تھا مگر اندلس کے باسے میر اس کی تاریخی معلومات حیرت انگیز تھیں۔

”اور پھر اس عہد کا مسلمان معاشرہ آج کے بے جا تعصب سے بھرپور عاری تھا۔ حسن کہہ رہا تھا۔“ مسلمان ہسپانیہ مذہبی رواداری اور ترقی پسند ثقافتی قدروں کا ایک ایسا روشن باب تھا جس کے بارے میں ہم لوگ بہت کم جانتے ہیں۔ یہ ایک متعصب اور تنگ نظر عہد نہ تھا بلکہ ایک ایسا روشن خیال اور وسیع النظر معاشرہ تھا جس میں عورت کو مرد کے برابر حقوق حاصل تھے۔ پردے کا رواج نہ تھا۔ ہزاروں عورتیں کتابت اور غزل گوئی کے فن سے آشنا تھیں۔ اندلس کی سب سے بڑی شاعرہ ولیدہ کو ہسپانیہ کی صوفیہ کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ فن موسیقی پر عبور رکھنے والے کو ایک عالم گردانا جاتا تھا۔ فلسفے کی ترویج میں مذہب اڑے نہیں آتا تھا کہ ابن رشد کے بقول انطاطون بھی درست کہتا ہے اور قرآن کے الفاظ بھی آخری سچائی ہیں۔ مذہبی رواداری کا عالم یہ تھا کہ یہودی اعلیٰ عہدوں پر فائز تھے۔ اندلس کی عظمت کے کئی ستون یہودی عالم اور مفکر تھے۔“

حسن کی بیوی اگرچہ انگریزی زبان سے ناواقف تھی مگر وہ نہایت محویت سے ہماری گفتگو سن رہی تھی۔ ننھا فرشتہ سوچکا تھا اور دوسرے بچے قایلین پر لیٹے اونگھ رہے تھے۔ میں اٹھ کھڑا ہوا۔ اب مجھے اجازت دیجئے۔“

”اتنی جلدی بھی کیا ہے۔ حسن نے میرے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا: ”شام کا کھانا ہمارے ساتھ تناول فرمائیے۔“

دراصل میں چاہتا ہوں کہ فوراً شہر جا کر مسجد قرطبہ دیکھ لوں۔
”مسجد تو اس وقت بند ہو چکی ہوگی۔ حسن نے گھڑی پر نظر ڈالتے ہوئے بتایا۔
”نوج رہے ہیں، کل دیکھ لیجئے گا۔“
”کل شاید نہ آئے۔“ میں نے ہنس کر کہا۔

”میں آپ کی بے قراری سمجھ سکتا ہوں۔ حسن مسکرا کر بولا: ”لیکن میرا تجربہ ہے کہ کل ہمیشہ آجاتی ہے۔۔۔۔۔۔ اگر آپ یہاں بیٹھے بیٹھے اکتا گئے ہیں تو آئیے سونگ پل کی جانب چلتے ہیں۔ بچوں کو سنانے کے بعد زبیدہ کھانا دہیں لے آئے گی۔“
کیمپنگ کے شاہانہ تالاب میں ایک بادشاہ اور لمبے سیاہ بالوں والی عورت بے حد منانٹ اور سنجیدگی سے تیر رہی تھی۔ اس کے بازو اتنی آہستگی سے پانی کو چھوٹنے کو تالاب میں ایک خفیف سی لہر بھی نہ اُبھرتی۔ ذرہ بھر ارتعاش پیدا نہ ہوتا۔
چھونس کی جھونپڑی کے باہر ایک عمر رسیدہ خادمہ بازو پر ایک چوغہ لٹکاٹے اُس کی جانب انتہائی شفقت کے عالم میں دیکھ رہی تھی۔ یہیں دیکھتے ہی وہ عورت تالاب سے باہر اُگنی اور اپنے سنہری بدن کو چرخے میں لپیٹ کر تو لیے سے بال سکھاتی دوسری جانب چلی گئی۔ بوڑھی خادمہ جس کے ہاتھ میں ایک چرمی تھیلا تھا اُس کے پیچھے پیچھے چلنے لگی۔ اُس کی خوف زدہ آنکھیں یوں گرد و پیش کا جائزہ لے رہی تھیں جیسے وہ کسی پر خطر جنگل میں تنہا ہو اور اس کے قدم اتنی احتیاط سے اٹھ رہے تھے کہ جیسے گھاس میں سانپ ریگ رہے ہوں۔ میں نے سوالیہ نظروں سے حسن کی جانب دیکھا۔ اُس کے سانولے چہرے پر گہری سوچ کی پرچائیاں تھیں۔

قرطبہ - دور افتادہ اور تنہا

جن دونوں غرناطہ کی شاہیں موسیقار غالا کی دلنواز دھنوں سے گونجتی تھیں ایک نوجوان شاعران دوستوں کی محفلوں میں اپنی ابتدائی نقلیں سنایا کرتا تھا۔ فریڈریک گارسیا لورکا۔ اُس نے ویگا کی مانند ہسپانوی لوک گیتوں کو جدید شعری سانچوں میں انتہائی خوبصورتی سے ڈھالا۔ ۱۹۲۰ء کے پُر آشوب ہسپانیہ میں پر دنا ریاکے گیت گانے کے باوجود وہ عوام کے ہر طبقے میں یکساں طور پر مقبول تھا کہ لارکا کے لیے ایک خانہ بدوش۔ ایک خنجر اور ایک گھڑسوار میں بھی اتنا ہی شعری زمانہ پنہاں تھا جتنا اُسے گارڈیا بول کی قہرائیگری طاقت میں دکھائی دیتا تھا۔ لورکا کی نقلیں اگرچہ نرم مزاج کی حامل ہیں لیکن یہ جذبات اس کے تن بدن میں سے یوں چھپتے ہیں جیسے اس کے خانہ بدوش کردار انتونیو کے جسم سے تیز دھاک کے پانچ قرار سے۔
مستور اور موسیقار ہونے کے ناطے سے اس کی شاعری میں سُر و لست طرز کی بوجھاؤ ہیں۔ ہمیں اس کی بیشتر نظموں میں قسمت اور موت کے احساسات اُجاگر نظر آتے ہیں جس کی واضح مثال قرطبہ کی اُداس چاہت میں لکھی گئی نظم ہے۔

قرطبہ

دور افتادہ اور تنہا!

میں ایک کالے خنجر پر سوار ہوں
میرے تھیلے میں چند زیتون ہیں

تنگ پتھر لی گئی ماضی کی عظمتوں میں خوابیدہ ایک ایسے شہر میں اُترتی تھی جو میرے لیے اُن دیکھا ہونے کے باوجود جانا پہچانا تھا۔ مجھے وہاں کسی راہبر کی ضرورت نہ تھی۔ میرے اندر کا قدیم انسان میری راہنمائی کے لیے جاگ اُٹھا تھا۔ محراب پر ایک سفید تختی آویزاں تھی۔ مزکینا۔ اس جانب۔ میں نے سر جھکا کر پہلا قدم اٹھایا، اور ٹائم مشین میں بیٹھے کسی ذہنی رُوح کی مانند صدیوں کے فاصلے آنکھ جھپکتے میں طے کر لیے۔ میں ماضی میں تھا۔

دور کا کے دل کا سب سے نازک کونہ قرطبہ کے لیے ہی مخصوص تھا جسے اُس نے ایک ایسی اُداس اور حسین عورت سے تشبیہ دی جس کے حُزن کا سبب کوئی نہیں جانتا۔ مجاہد نے اسے خاموش۔ موروں کا قرطبہ کہا۔ میں نے جو قرطبہ دیکھا وہ غُشبوؤں کا شہر تھا، شوخ رنگوں کی تصویر تھا۔ ایک روشن منظر تھا۔ میں اُسے خوشبو، رنگ اور روشنی کا قرطبہ کہتا ہوں۔ درود دیوار سے گنتی ہوتی نیاز بو۔ گلاب اور چنبیلی کی بیلوں میں سے مائل بہ سفر خوشبو، کھڑکیوں میں لگے پُریچ آہنی سلاخوں کے اُگے رکھے سرخ گھلوں میں کھلے جرنیم اور کارمشین کے بے شمار پھول۔ دُور سے دیکھیں تو دیواروں کی چندھیاہینے والی سفیدی کے پس منظر پر شوخ رنگوں کے دھبوں کی صورت نظر آتے ہیں اور روشنی..... قلعی کٹے ہوئے ان تمام مکانوں کی جن پر نظر نہیں ٹھہرتی۔ عربوں کی تعمیر کردہ گلیوں کے ناہموار فرش جن میں پورستہ گول گول پتھریوں قدموں تلے آتے ہیں جیسے آپ کسی سُوکھی ہوئی ندی کی تہ پر بچھے کنگروں پر چل رہے ہوں۔ درود دیواروں کی دراڑوں میں سے جھانکتی خود رو گھاس۔ کچے مکانوں کی چھتوں پر لٹی کے تنہا پھول! اینی گلیوں میں سینکڑوں پاتیر چھپے ہوئے ہیں۔ پاتیر! موروں کے صحنی باغ جنہوں نے اپنے حُصین باطن اور سادہ ظاہر کے درمیان جالی دار دروازوں کے آہنی نقاب جائل کر رکھے ہیں۔ گلیوں میں چلتے جاہیے اور آپ کے ہر سو پوشیدہ حُسن کی جھلکیاں

اور آسمان پر پورا چاند! اگرچہ یہ راستے میرے جانے پہچانے ہیں مگر..... میں کبھی بھی قرطبہ نہیں پہنچ پاؤں گا! میدانوں میں سے، ہواؤں کو چیرتا کالا پتھر۔ سُرخ چاند! موت مجھ پر نظریں جمائے دیکھ رہی ہے قرطبہ کے میناروں سے۔

آہ! یہ طویل راستے۔
آہ! میرا بہادر چچر
آہ! انجام یہ کہ موت میری منتظر ہو
اس سے پیشتر کہ میں قرطبہ پہنچوں!
قرطبہ
دُور افتادہ اور تنہا!

دور کا کی المناک پیش گوئی پوری ہوئی۔ وہ قرطبہ نہ پہنچ سکا۔ موت اس پر نظریں جمائے دیکھ رہی تھی مگر قرطبہ کے میناروں سے نہیں غرناطہ کے بُرجوں سے جہاں صرف اڑتیس سال کی عمر میں ہی اُسے فاشسٹوں نے ہلاک کر ڈالا۔ سو گواہوں نے کہا۔ "دور کا مر گیا۔ غرناطہ اب بغیر دل کے ہے۔" قرطبہ دور کا کے لیے دُور افتادہ اور تنہا ہی رہا مگر میں آج میدانوں میں سے، ہواؤں کو چیرتا قرطبہ پہنچ گیا تھا۔ میں قرطبہ کے مرکزی چوک پلازائے نو سے انتونیو کے دائیں کونے میں ایک بلند محرابی دروازے آر کو دیل پورتلو کے تلے ایک ایسی بے نام سرحد پر کھڑا تھا جہاں میرے پیچھے جدید عمارتوں، بھڑکیلے نیمک سائٹوں اور کشادہ شاہراہوں کا ایک ایسا پرہجوم شہر آباد تھا جس سے میری شناسائی نہ تھی اور میرے سامنے ایک

ہاتھوں پر اٹھا کر اس راستے پر لے جایا گیا جہاں سے کبھی حضرت موسیٰ بن اسرائیل کو لے کر گزرتے تھے۔ بقول القفقی ماہر طب ابن میمون آخری عسمر میں مسلمان ہو گیا تھا۔

ایونیوایو سے روس یا ابن رشد مشربٹ اُن دونوں کی یاد دلاتی ہے جب عظیم فلسفی ابن رشد ابہی گھریوں میں سر جھکانے قرآن اور افلاطون کے فلسفے میں باہمی ربط کی تلاش میں سوچ بچار کیا کرتا تھا جس نے المنصور کے دربار میں اشبیلیہ قرطبہ کی علمی فضیلت کے بارے میں ایک بحث کے دوران ابن ظہر سے کہا تھا "مجھے معلوم نہیں آپ کیا کہہ رہے ہیں مگر مجھے یہ ضرور معلوم ہے کہ جب قرطبہ میں کوئی مرستی قرار فرماتا ہے تو اس کے ساز اشبیلیہ بھیجے جاتے ہیں جہاں وہ بہک جاتے ہیں، لیکن جب ایک عالم اشبیلیہ میں فوت ہوتا ہے اور حکومت اس کی کتابیں فروخت کرنا چاہتی ہے تو وہ قرطبہ بھیج دی جاتی ہیں، دانستے نئے افلاطون میرا استاد ہے اور ابن رشد اس کا پیغمبر کے الفاظ میں ابن رشد کی عظمت کا اعتراف کیا ہے۔ اہل قرطبہ ابن رشد کو مسلمان ہونے کے باوجود آج بھی اپنا غیر ترین فرزند سمجھتے ہیں۔ اُن کے اس فخر کی علامت سنگ مرمر کا وہ خوبصورت مجسمہ ہے جو القصر کی دیوار کے سامنے میں نصب ہے۔ ابن رشد عرب لباؤں میں طبرس، سر پر ایک تہ دار گڑھی اور پاؤں میں ایک نوک دار جوتی۔ فلسفے کی پناہیوں میں کھویا ہوا۔

ایونیوایو سے روس کے قریب قرطبہ کا میونسپل ہسپتال ہے اور یہاں ایک مرتبہ پھر آپ کو اس شہر پر عرب تہذیب کے ہم گیر اثرات کا ایک اور پہلو علم بدن کے ماہر القافقی کے مجسمے کی صورت میں ملتا ہے۔ اس مجسمے کو پہلی بار میں نے ایک اندھیری شب میں دیکھا جب قرطبہ کی گلیاں سنسان ہو چکی تھیں اور میں کیمپنگ واپس جا رہا تھا۔ مجھے واسمہ سا ہوا کہ ایک تاریک گلی کے آخر میں کوئی عرب سائیک

پاؤں کی زنجیر بستی چلی جاتی ہیں۔ بلندی سے قدیم قرطبہ ایسے نظر آتا ہے جیسے پہلے ایک وسیع باغ تھا۔ پھولوں، سیلوں کے جھنڈ اور لاتعداد اُبلتے فوٹے اور پھر ان کے گرد سفید درودیلو اور کچریوں اٹھے کہ اُسے سینکڑوں چھوٹے چھوٹے خوش رنگ قطعات میں منتشر کر دیا۔

آج صبح شہر آنے سے پیشتر جب میں نے جن سے مسجد کا راستہ دریافت کیا تو وہ اپنے سفید دانتوں کی نمائش کرتے ہوئے کہنے لگا "متم تو پچھلی شب کتنے تھے کہ اس مسجد کی محرابوں نے تمہیں ایک ڈوری میں باندھ رکھا ہے۔ بس اسی ڈور کے ساتھ ساتھ چلتے جاؤ خود بخود پہنچ جاؤ گے۔"

چنانچہ اب میں سمت کا تعین کئے بغیر ایک ایسی مچلی کی مانند خاموشی سے تیرتا چلا جا رہا تھا جسے معلوم تھا کہ وہ جان بوجھ کر شکار ہو چکی ہے اور شکاری دھیرے دھیرے دوسرے اُسے کٹاؤں کی جانب کھینچ رہا ہے۔

فصل قرطبہ کے پائیں باغ میں باب المذکر کے سامنے مشہور رومی ڈرامہ نگار اور فلسفی سنیکا کا سفید مجسمہ ایسا وہ تھا۔ قدموں میں ایک وسیع تالاب میں بیشمار مچھلیاں تیر رہی تھیں سنیکا جلتے ہوئے روم کا قاتل دیکھنے والے شہنشاہ نیروکا استاد تھا۔ آگ سمنے کو کندن بناتی ہے اور بد نصیبی انسان کو "نیروکے حکم پر خود کشی کرنے سے پیشتر سنیکا کے آخری الفاظ۔

باب المذکر میں داخل ہوتے ہی المنظر اور ابن رشد کے پُرانے محلے میں جہاں عربوں کے عہد میں یہودی رہائش پذیر تھے۔ صلاح الدین الیوبی کے ذاتی معالج یہودی ابن میمون کا مجسمہ اس کے گھر کے سامنے نصب ہے۔ یہودی آج بھی اس بات پر کامل یقین رکھتے ہیں کہ علاج مریض اگر تاہرہ میں واقع ابن میمون کے عبادت خانے میں ایک شب بسر کرے تو اُسے مکمل شفا ہو جاتی ہے۔ ابن میمون کا انتقال تاہرہ میں ہوا جہاں وصیت کے مطابق اس کی لاش کو

پختہ سڑکوں کا ایک سلسلہ تھا اور ہر مکان کے دروازے پر ایک لالین نصب تھی جبکہ اس عہد کے سات سو برس بعد تک بھی لٹن کے بعض گلی کوچوں کو ایک بھی روشنی میسر نہ تھی اور پیرکس میں بارش کے بعد جو کوئی بھی گھر سے باہر قدم رکھتا گھٹنوں تک کچھڑ میں دھنسن جاتا۔ شدید گرمی میں تمام شاہراہوں پر سائبان تان دیئے جاتے جو مسافر باب المدینہ سے شہر میں داخل ہوتا وہ وادی الکبیر کے پل تک ان کی چھاؤں میں سفر کرتا۔ اس روایت کی پیروی محمد و دوسرے پر اب بھی جاری ہے۔

میں باب المدینہ میں سے آنے والی سڑک کو ندے گوئدے مار کے ایک نہر خانے میں دو پہر کا کھانا کھا رہا تھا کہ کارپوریشن کے عملے نے لمبے بانسوں کی مدد سے پوری شاہراہ پر سائبان کھول دیئے اور کوئدے گوئدے مار قدیم زمانوں کی طرح سورج کی تپش سے محفوظ ایک سایہ دار راہگزر بن گئی۔

اندلس اور بقیہ یورپ کے درمیان تہذیب و تمدن کی اتنی وسیع فلیج حاصل تھی کہ تولید کے منصف سعید کو یورپ کے باشندوں کے بارے میں کہنا پڑا۔ ان کی آب و ہوا سرد اور فضا ابر آلود ہے چنانچہ سورج کی کرنیں ان کے دماغ تک نہیں پہنچ پاتیں۔ اس لیے ان کے مزاج سرد ہیں اور ان کے مزاج میں پھکڑ پن ہے۔ ان کے سفید جسم چھوٹے ہوئے ہیں اور بال بے تھما شا بڑھے ہوئے ہیں۔ وہ حاضر جوابی سے ناواقف ہیں اور ان کی عقل میں کچھ نہیں آتا جبکہ حماقت اور بدتمیزی ان میں عام ہیں۔ احساس برتری کا یہ جذبہ شاید اتنا بے جا بھی نہ تھا کیونکہ ہم دیکھتے ہیں کہ جن دنوں آکسفورڈ کے معلم غسل کو ایک غلیظ گناہ قرار دیتے تھے قرطبہ کے سائنسدان اور فلسفی شاندار حاملوں میں بیٹھے علمی بحثوں میں محو تھے۔ ڈوڈی کہتا ہے کہ اس عہد میں اندلس کا ہر فرد تعلیم یافتہ تھا۔ جب کہ یورپ میں پادری بھی کوئے ان پڑھ تھے۔ ہمسایہ عیسائی حکمرانوں کو اگر تعزیر لباس تراشی اور طب کے میدان میں کسی ماہر کی ضرورت پیش آتی تو

کھڑا کھڑے گھور رہا ہے۔ میں خرفزدہ ہو گیا مگر قریب جانے پر معلوم ہوا کہ ایک سفید مجسمہ ہے۔ دیاسلمانی جلا کر کندہ عبارت پڑھی۔ "القافقی"۔ اس وقت میں اس ماہر طب کے نام سے ناواقف تھا بہر حال یادداشت کے طور پر اپنی ڈائری میں نوٹ لکھا۔ آج شب ایک ناریک گی میں القافقی نام کے کسی عرب کا مجسمہ دیکھا۔ جانے کن ہے جس پر آج بھی قرطبہ کو ناز ہے۔ عربوں کا سب سے بڑا سرجن النظارہ دی بھی قرطبہ میں پیدا ہوا۔ بقول فلپ ہتی جدید یورپی سرجری کی بنیاد النظارہ دی کی وہ کتاب ہے جو اس نے علم بدن پر تحریر کی۔ میں نے باب اشبیلیہ کے باہر ایک ندی کے کنارے ابن حزم کا ایک مجسمہ بھی دیکھا جو شہرہ آفاق شعری مجموعہ "طوق الحمامہ" کے علاوہ چار سو کتب کا مصنف تھا۔ ابن حزم مذہبی تقابل کے میدان میں دنیا کا اولین مفکر تھا۔ قرطبہ کی خاک سے جنم لینے والوں اور یہاں کے خاک نشینوں میں سے کس کس کا نام لوں..... ابن زیدون۔ ابن فاروق۔ ابن داؤد۔ ابن عبدالرہابی۔ ابن قفحانی۔ البقری۔ المجریطی۔ الکرمانی۔ غرضیکہ نابغہ روزگار شخصیتوں کا ایک طویل سلسلہ ہے جس کی تفصیل بیان کرنے کے لیے ایک عمر درکار ہے۔ عام خیال کے برعکس شہر کے گلی کوچوں میں القصر اور قدیم فصیل کے سائے میں ایسا وہ مجسمے ماضی کی عظمتوں کے وہ نشان ہیں جو اس امر کی گواہی دیتے ہیں کہ اہل قرطبہ عرب ماضی کو اپناتے ہیں تسلیم کرتے ہیں۔ انہیں اس پر فخر ہے۔

قدیم قرطبہ میں وہ کونسی ایسی کشش تھی جس کا طلسم آج بھی ان گلیوں میں خاموشی سے رواں ہے! فلپ ہتی نے اسے بغداد اور قسطنطنیہ کے ہمراہ دنیا کے تین روشن ترین شہروں میں شمار کیا۔ دس لاکھ سے زائد آبادی کے اس شہر میں ایک لاکھ تیرہ ہزار مکان اور حویلیاں تھیں سو غالباً حمام اور ستر سرکاری لائبریریاں تھیں جہاں تین ہزار خواتین قلمی نسخوں کی کتابت پر مامور تھیں میل ہا میل تک

وہ قرطبہ کی جانب رجوع کرتے۔ ادھر اگر مسجد قرطبہ کی بین الاقوامی درس گاہ میں ایک پوپ زیر تعلیم تھا تو ادھر پیرس کی سارلبن یونیورسٹی ایک ایسی عمارت میں واقع تھی جس کی بلانی منزل پر تودرس و تدریس کا سلسلہ جاری رہتا اور زیریں حصہ میں رنڈیاں پیشہ کرتیں۔ قرطبہ میں چڑے۔ کاغذ اور کپڑے کی صنعتیں بھی مدرس و سنگاروں نے قائم کیں۔ آج بھی دیوار مسجد کے مقابل بازار میں چڑے کی ایسی مصنوعات فروخت ہوتی ہیں جن پر کندہ نقش و نگار اور ڈیزائن خالص نورش ہیں۔ زیر زمین نالیوں کے نظام کے علاوہ قرطبہ یورپ کا پہلا شہر تھا، جہاں سرکاری طور پر سرگھر میں آب رسانی کا انتظام تھا۔ ایک قرطبن نے مجھے بتایا کہ اُس کے پاتیر کے فرائے میں اُبلتا پانی اب تک اُسی تانبے کے پائپ میں سے گزر کر آتا ہے جو صدیوں پیشتر نورش کارگروں نے زیر زمین بچھایا تھا۔ قرطبہ کا زیریں مدرس عہد پانچ سو برس پر محیط ہے اور اس کے خاتمے پر جیمز مشنر کے بقول عیسائیوں نے آخری جنگ تو جیت لی مگر شاعری، فلسفے، تاریخ اور زراعت کی جنگ ہار گئے۔

آج کا قرطبہ خاموش اور اُداس تو ہے مگر میں اُن سیاحوں سے اتفاق نہیں کرتا جو اسے ایک پرانی تہذیب کا مُردہ کھنڈر کہتے ہیں۔ ایسے سیاح تاریخ کے صفحوں میں گم قرطبہ آتے ہیں۔ وہ ایک زندہ شہر اور اس کے زندہ دل لوگوں کے درمیان ماضی کے جوڑے میں بند چلتے ہیں اور دبیز کتابوں کی اوٹ میں یہاں سے چلے جاتے ہیں۔ قرطبہ کے اکثر مکانات کی کھڑکیاں منتقش آہنی جالیوں سے مزین ہیں جن میں اداستہ نیلے گلوں میں سے خوش رنگ ٹھول باہر جھانکتے ہیں۔ یہ خوش رنگ ٹھول شاندار ماضی ہیں جنہیں دیدہ و بینا وقت کی اُس دیوار کے پار دیکھ لیتی ہے جو پڑیچ جالیوں کی صورت میں درمیان میں حائل ہے۔ سوئم پچھلے زمانوں میں بھی جیتے ہیں حال کے رنگوں، روشنیوں اور خوشبوؤں میں سانس

لیتے ہوئے بجائے اس کے کہ ہم ہمہ وقت ایک ایسی عینک لگا کر اشیاء کا مشاہدہ کرتے رہیں جس کے شیشوں پر تاریخ کی روشنائی مل دی گئی ہو۔ یورپ میں کونسا ایسا شہن پرست شہر ہے جہاں موسم بہار میں "فی انساٹے پاتیر کو رو دس" ایسا میل منعقد ہوتا ہے۔ چار دیواریوں میں گھرے مختصر باغوں یا پاتیر کو سجانے کا سالانہ جشن۔ رات کے پچھلے پیراس کی گھوڑوں میں کانتے ہونہر کی قدیم عرب موسیقی گونجتی ہے۔ سحرانیشینوں کے تھمر کردہ خوش وضع فرائے اب بھی چوکوں اور پاتیر زمین ڈال ہیں چشم غزال اگرچہ کم ہے مگر منشی بدستور قائم ہے۔ پلازاخو سے انٹرنیو کے گھڑیاں کی موسیقیت سے لبریز آواز جب نصف شب شہر کے بام و در پہ گونجتی ہے تو بدن میں ایک خوشگوار سنسنی پھیلنے لگتی ہے۔ کیا یہ ایک مُردہ شہر کی نشانیاں ہیں؟

"ذکو کے عرب محلے میں سے گزرتے ہوئے مجھے ایک منتقش پتھر آیا جس کے پڑیچ نقاب کے پیچھے شاید قرطبہ کا حسین ترین پاتیر چھپا ہوا تھا۔ میں تصویر بنانے کے لیے اُس آہنی چلن کے سوراخوں میں سے تاک جھانک کر رہا تھا کہ ایک مُقرر قانون نے چپکے سے پتھر ہٹا کر رکھ دیا۔"

"یوں چوڑوں کی طرح کیوں جھانک رہے ہو۔ اندر آ کر دیکھ لو۔"

چنانچہ اندر جا کر دیکھا۔ پاتیر کی چار دیواری مارشل نیل قسم کے گلاب اور عیش پیچاں کی تار بیلوں سے ڈھکی ہوئی تھی۔ ان میں کہیں کہیں مُسلم نیلے رنگ کے گلے بے ترتیب سے شگے ہوئے تھے۔ ان گلوں میں پھولدار پودے اور جنگلی گھاس کی مختلف اقسام اُگی ہوئی تھیں۔ صحن گول سنگریزوں سے ترتیب دیا ہوا تھا۔ بیچ میں ایک ٹنگنا سا کائی آلود فوارہ تھا جس کا پانی پیالے کے کناروں سے بہ کر سنگریزوں پر پھیل رہا تھا خوشگوار ٹھنڈک اور سکون کی ایک ایسی فضا جو ایک مرتبہ لاہور کی تپتی دوپہر میں میں نے مبارک حویلی موچی دروازے کے اندر ایک کچی کوٹھڑی میں بیٹھے ہوئے

محسوس کی تھی۔ پاتیر کے عقب میں گھٹوں کے درمیان گچ کی بنی ہوئی تین مورش طرز کی انتہائی خوبصورت محرابیں کھڑی تھیں جو خط کوئی میں مکھے گئے مکہ شریف سے مزین تھیں۔ قدامت کے باوجود دیوں گنا تھا جیسے ابھی پچھلے ہفتے ہی انہیں تعمیر کیا گیا ہو۔ عرب صناعتی کے دیدہ زیب شاہکار۔ ایک کونے میں سرخ ٹائلوں سے ڈھکا ہوا ایک قدیم کنواں تھا۔ قریب میں پرانی وضع کی دو صراحیاں اور مکے دھڑے تھے، دیواروں کو گھٹوں کے علاوہ پتیل کے چمکتے ظروف سے بھی سجایا گیا تھا۔ میری سمجھ میں یہ نہیں آ رہا تھا کہ آخر اتنی بندی پر مٹکے گلوں کی آبپاری کیونکر کی جاتی ہے۔ میں نے بوڑھی مالک سے دریافت کیا تو وہ سفید بالوں کا جوڑا درست کرتی ہوئی بولی۔ ”بہت آسان ہے“ اور کونے میں رکھا ایک طویل بانس اٹھا لائی جس کے سرے پر ایک ٹین کا ڈبہ ترچھے رخ بندھا تھا۔ اُس نے یہ خود ساختہ آبی پیانا کنوئیں کی تہ میں اتار دیا، اور پتلیں کوٹنے کے انداز میں اُسے سیدھا کھڑا کر کے ایک گھٹے پر جھکا دیا۔ بوکا ناگلے میں اُگی گھاس سیراب ہو چکی تھی۔ تھوڑی دیر بعد گلے کے نیچے سوراخ میں سے پانی ٹپکنے لگا۔ میں نے اس مظاہرے کا شکریہ ادا کیا اور پاتیر کی تعریف کرنے کے بعد باہر جانے کو تھا کہ اُس نے میرا بازو محکم کر پوچھا۔

”میری مورش محرابیں نہیں دیکھیں۔ ابھی پچھلے ہفتے ہی بنوائی ہیں۔“

”پچھلے ہفتے؟“ میں نے اچنبھے سے پوچھا۔

”ہاں! فورسٹ پسند کرتے ہیں جس پاتیر میں محراب نہ ہو اُسے دیکھنے نہیں ملتے۔“ قرطبہ کی گھٹوں میں دن کے وقت سیاحوں کے علاوہ صرف چھوٹے بچے ملتے ہیں۔ مرد عموماً کام پر چلے جاتے ہیں۔ عورتیں اگر جوان ہوں تو گھر کے کام کاج میں مصروف ہو جاتی ہیں اور اگر ادھیڑ عمر ہوں تو انہیں دروازوں کے باہر سیاحوں کو اپنا پاتیر دکھانے کے لیے بٹھا دیا جاتا ہے۔ اگر ایک سیاح بھی ان کے پاتیر کی

دل کھول کر تعریف کر دے تو انہیں سارے دن کی جھپک کا صلہ مل جاتا ہے۔ رات کو دادی اماں پوسے خاندان کے سامنے رپورٹ دیتی ہیں اور بڑے فخر سے اعلان کرتی ہیں کہ آج ہمارے پاتیر کو اتنے درجن سیاحوں نے دیکھا۔

”ذکوئے مکے“ محلے میں چند ایسے مکان بھی ہیں جو عربوں کے زمانے میں مسلمانوں کی حویلیاں تھیں۔ تاریخ میں ان کے بڑے عجیب و غریب نام درج ہیں۔ چٹولوں والی، پیار کی شدت، ”خوشیوں کا گھر“ وغیرہ۔ میں یونہی پاتیر میں جھانکتا ہنگ گھٹوں میں آفتاب کی قنارت سے بچنے کی خاطر دیواروں کے سائے میں چلتا پلازا سے پور تو تک پہنچ گیا۔ میں نے مکے آسمان پر نگاہ ڈالی۔ نیلا ہٹ سپاٹ اور بکراں تھی۔ اس کی دستوں میں مجھے کہیں بھی مسجد قرطبہ کا مینار بلند ہوتا نظر نہ آیا۔ چوک کے درمیان میں ایک پرانی طرز کے فوٹے کے پیالے میں چند قرطبی بچے نیکری پیہنے منانے میں مصروف تھے۔ مجھے دیکھتے ہی ان میں سے ایک چھلانگ لگا کر نیچے اُترا اور فٹ پاتھ پر پڑا چائسٹک کا لفافہ اٹھا کر میرے پاس آگیا۔

”ایس اسٹد مردو؟“

”ہی“ میں نے خوش دلی سے جواب دیا۔ شاید مژدوں کی بات ہوئی تھی۔

”پوسٹ کارڈ۔ مزکینا!“ اُس نے لفافے میں سے مسجد کا ایک تصویری پوسٹ کارڈ نکال کر آگے کر دیا۔ ”ٹائو لیسیتہ“

میں نے پانچ پیسے کا سکہ اُس کی گیلی ہتھیلی پر رکھ کر کارڈ لے لیا اور وہ پھر فوٹے کے پیالے میں گھس کر منانے میں مشغول ہو گیا۔

مسجد کی تعمیر کے اولین سالوں میں یہ بلند محراب نما چھانک پورا کا پورا سونے کے کام سے مزین تھا۔ قرطبہ کی دھوپ میں بابِ توبہ کی سنری چمکتی ہوئی کی نیم تاریک گلیوں کو بھی روشن کر دیتی۔ مسلمانوں کے اخراج کے بعد اس صدر دروازے کو بھی بقیہ عمارت کی طرح حضرت مریم اور عیسیٰ کی شبیہوں سے بپتسمہ دے دیا گیا۔ میں زرد مینار کے قدموں میں بابِ توبہ کے سامنے دیر تک کھڑا رہا۔ مجھ کو اندازہ نہ تھا کہ جی نہ چاہتا تھا مگر پھر صحن میں دکھائی دینے والے نارنگی اور کھجور کے درخت ہوا سے یوں حرکت میں آئے جیسے مجھے اپنی جانب بلا تے ہوں۔ شکاری نے بھی دور اس شدت سے کھینچی کہ قدم خود بخود اٹھنے لگے اور میں مسجد قرطبہ کے صحن نارنجستان میں داخل ہو گیا۔

قرطبہ شاعر رکاز نے اسے ”چمکتی دھوپ اور سایوں کا صحن“ کہا ہے۔ پست قد نارنگی کے درختوں میں سے بلند ہو کر تن اور کھجور کے چرواں پتے مینار کی دوسری منزل تک پہنچ رہے تھے اور ان کے سائے ہوا کے چلنے سے ایک توڑ کے ساتھ پھیلتے اور پھر سمٹتے چلے جاتے۔ گرم گشتہ صحن کی متحرک پرچھائیوں کی طرح۔ بائیں جانب زیتون کے ایک صدیوں پرانے درخت کے سائے میں وضو کا تالاب تھا جس کے چاروں کونوں میں ایسا وہ فواروں کا پانی ایک ابدی تسلسل کے ساتھ حوض میں گر رہا تھا۔ حاکم کا تعمیر کردہ یہ تالاب زیتون کی قربت کی مناسبت سے ”زیتون کا فوارہ“ کہلاتا ہے۔ حاکم کے عہد سے پیشتر پانی سے بھرے ہوئے چٹے پتھر پر لاد کر صحن میں لائے جاتے اور یوں ہوا زانہ تالاب کو بھرا جاتا۔ حاکم نے مرا مورینا کی بلند یوں پر نئے حوض تعمیر کروائے اور پھر تانے کے نول کے ذریعے ان کا پانی مسجد کے تالابوں تک پہنچا کر مسلسل آبِ رسانی کا انتظام کیا۔ ”زیتون کے فوارے“ میں اب تک حاکم کے پچھائے ہوئے نول کے ذریعے ہی پانی آتا ہے۔ نارنگیوں کے پتوں سے ہکتے اسی صحن

ہجومِ نخیل

کالے کو مید اس کے پہلو میں سے ایک تنگ گلی نکلتی ہے، کالے لاس غدارس یعنی پھولوں کی گلی۔ بالکل اسم باہمی، سجادہ میں اتنی نفاست گمان ہوتا ہے کہ کسی جا پانی گیشا گل نے پھولوں اور شاخوں کو ترتیب دیا ہے۔

لاس غدارس کے پھولوں میں مجھے مسجد قرطبہ کے زرد مینار کی پہلی جھلک دکھائی دی۔ ایک چوکور حجم قرطبہ کے نیلے آسمان کی وسعتوں کو چھو رہا تھا۔ مینار کی چوٹی پر تین بڑے گھڑیاں لگی ہوئی تھیں جیسے کسی نے تین سیاہ کمزل اٹا کر رکھ دیئے ہوں۔ مجھے تو چوٹی کے اوپر صرت قرطبہ کے حفاظتی سینٹ رافیل کا مجسمہ ہاتھ پھیلائے شرکی عمارتوں پر سایہ نگین دکھائی دیا۔ میں اقبال کی چشم بنیا کماں سے لاتا جاؤں یہ منار بلند جلوہ گر جبریل نظر آیا اور میں نے کچی اینٹوں کی ایک محراب میں پیوست بند پھاٹک کا زنگ آؤد کُند اسر کا یا اور میں مسجد قرطبہ کے مینار کے قدموں میں کھڑا تھا۔

مہاشام کے تعمیر کردہ اس شامی طرز کے چوکور مینار کے پہلو میں سے نکلتی ہوئی ایک فصیل نما زرد دیوار نے جامع قرطبہ کے صحن اور ڈھکے ہوئے حصے کو اپنے شکستہ بازوؤں میں سمیٹا ہوا تھا۔ بابِ توبہ کھلا تھا۔ بابِ توبہ مینار کے نیچے صحن مسجد میں داخل ہونے کا واحد راستہ ہے۔ آہنی کواڑوں پر پیوستہ سینکڑوں چھوٹی چھوٹی پتریاں خط کوئی میں کندہ کلمہ شریف کا ورد کر رہی تھیں۔

میں بیٹھ کر المنصور نے اندلس کی وزارت عظمیٰ کا خراب دیکھا اور پھر اس مسجد کی بیرونی دیواریں شاہد ہیں کہ المنصور سینٹ جیمز کا ناقابل تسخیر اور مغرور شہر سنانی پور فتح کر کے لوٹ رہا ہے اور اُس کی فوج کے آگے لگے ہزاروں شاہی قیدی سنانی ایگو کے کلیسا نے اعظم کا وزنی گھڑیاں اور صدر دروازہ کندھوں پر اٹھائے چلے آ رہے ہیں۔ گھڑیاں اور آہنی دروازے کو پگھلا کر مسجد کے لیے دو سو اتالی فائوس ڈھالے گئے۔

میرے عقب میں باب تو رہا تھا۔ دائیں اور بائیں تاریکیوں کے دوختوں کی قطاریں اُن طویل برآمدوں تک پہنچتی تھیں جو دیوار کے ساتھ ساتھ چلے آتے ہیں۔ کلیسا میں صبح کی عبادت کو آنے والے اسنی برآمدوں میں کھلتے ہوئے دو دروازوں میں سے صبح کے اندر داخل ہوتے ہیں اور میرے سامنے بظاہر ہرٹ سے بند ایک غیر موثر مستطیل عمارت کھڑی تھی جس کی سرخ ٹائلوں کی چھت میں سے جابجا نکرنے آتش دان نما برج اُٹھے ہوئے تھے۔ طرز تعمیر سے مسجد کی بجائے کسی قدیم حویلی کا گمان ہوتا تھا۔ سامنے کی پوری دیوار میں محراب نما دروازوں کی ایک قطار تھی جو کسی زمانے میں صحن پر کھلتے تھے مگر پھر ایسے عبادت گزار آئے جن کے لیے معبد میں روشنی کا تصور ناقابل برداشت تھا۔ مسجد نے کلیسا کا رُوپ دھار تو ایک کے سوا تمام کے تمام محرابی دروازے مجبوری اینٹوں سے چُن فیے گئے۔ اینٹوں سے پُر یہ محرابی دروازے اُس اندھے کی طرح بے بس اور لاچار کھڑے ہیں جو صدیوں روشنی سے آشنا ہونے کے بعد اپنے آگے تاریکیوں کی ایک دیوار کھڑی دیکھ کر ٹھٹھک کر رہ جاتا ہے۔ ایک بلند محرابی دروازہ جسے اینٹوں کی بجائے لکڑی کے تختوں سے بند کیا گیا تھا مسجد میں داخلے کی واحد صورت نظر آتا تھا۔ محراب کے اوپر ایک نو تعمیر کردہ چوکھے پر مریم کا بت نصب تھا اور لاطینی زبان میں مذہبی دعائیں

درج تھیں۔ بائیں ہاتھ پر دروازے کے پہلو میں نیلی وردی پہنے ایک موٹا ہسپانوی لکڑی کی ایک کیبن کے ساتھ ٹیک لگائے اخبار پڑھ رہا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی اس نے انتہائی عجلت میں اخبار سمیٹا اور بغل میں دابی ٹوپی سر پر جما کر جلدی سے کیبن میں گھس گیا۔

”موسیو تورستا!“ اس نے کیبن کے سوراخ میں سے ہاتھ نکال کر کاؤنٹر بجایا۔ ”میں پسیتے۔“

مسجد میں داخلے کا پروازہ بالائسنس ڈمی وزنا سبز رنگ کا تھا اور اس پر کلیسا کے قریب کی زیارت کے لیے۔ میں پسیتے۔ نمبر ۵۸۹۹ کے الفاظ درج تھے۔ میں پسیتے صندوقچی میں گر کر مسجد کا موٹا محافظ پھر کیبن سے باہر نکل آیا اور بڑے استہام سے چلتا ہوا دروازے میں چنے تختوں کے قریب جا کھڑا ہوا۔ ”موسیو تورستا!“ اس نے انگلی میں خم دے کر مجھے اپنی جانب آنے کا اشارہ کیا۔ میرے قریب پہنچنے پر اس نے اپنے ہی جادوی کئے ہوئے ٹکٹ کو نہایت غور سے جانچا اور پھر ایک کونہ عینہہ کر کے مجھے واپس کر دیا۔

”صبح بخیر! آپ آج صبح کلیسا کی زیارت کے لیے آنے والے پہلے سیاح ہیں۔ اُس نے ٹوپی اتار کر بغل میں داب لی اور مسکرا کر کہا۔

”صبح بخیر“ میں نے ٹکٹ کا بقیہ حصہ نہایت احترام کے ساتھ اپنی جیب میں محفوظ کرتے ہوئے جواب دیا۔ ”میں آج صبح مسجد..... کی زیارت کے لیے آنے والا پہلا سیاح ہوں۔“

محافظ کے چہرے سے مسکراہٹ فوری طور پر غائب ہو گئی۔ اس نے مزید گفتگو کی بجائے اپنی ٹوپی پھر سر پر جما کر اُسے غصے سے تھپکا اور لکڑی کی دیواریں نصب ایک چھوٹے سے پھاٹک کی چٹخنی کھول کر مجھے اندر جانے کا اشارہ کیا۔ میں نے جو نئی تاریکی کے اس مستطیل ٹکڑے کے اندر قدم رکھا میرے پیچھے چائیک

بند ہو گیا۔ کھٹاک! کھٹاک! چٹخنی چڑھانے کی آواز وسیع خلاؤں میں گونج گئی۔ باہر کی دنیا سے میرا رابطہ کٹ چکا تھا۔

میں خشک اندھیروں کی بے کراں خلاؤں میں تنہا کھڑا تھا۔ میں تنہا اور دودراؤں میں گر کھچاؤ سے آزاد اور پرسکون۔ پھر گھپ اندھیرا تاریکی میں بدلنے لگا۔ میرے گرد آپس میں گڈمڈ ہوتی ہوئی نامعلوم شبیبیں تھیں۔ بے جہت ہیولے حرکت میں تھے۔ تاریکی سے نیم تاریکی تک کے سفر میں مدتیں بیت گئیں۔ خلاؤں میں اب غیر واضح نقوش بکھرنے لگے۔ پھر بکھرتے۔ تیرتے نقوش یکجا ہو کر ساکت ہو گئے۔ ایک سنان اور گھنا جنگل۔ میں آنکھیں جھپکے بغیر اپنے دونوں ہاتھ فیکروں کی طرح سامنے پھیلائے آگے بڑھا۔ سہارے کی متلاشی انگلیاں کسی سرد و مرمریں شے سے چھو گئیں۔ میں نے دوسرے ہاتھ سے اُسے ٹٹولا۔ شفاف سطح پر آنکھیاں پھسلیں اور پھر چند اُبھرے ہوئے الفاظ پر اکٹم گئیں۔ میں نے اُبھری ہوئی عبارت پر آہستہ آہستہ اپنے پوٹے دبائے۔ آنکھوں سے محروم ایک شخص کی طرح جو خط بریل کو اپنی انگلیوں کے لمس سے پڑھنے کی پہلی کوشش میں مصروف ہو۔ پوٹوں کی ٹٹولتی آنکھوں نے خبر کی۔ پیٹلے لائے۔ اس کے بعد اللہ آتا ہے۔ اور..... اور پھر تنہا مادے سے کھنے کے بعد میرے کانوں میں اُنزلے والی پہلی آواز گونجی۔ لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ۔ اندھیرے چھٹنے لگے۔ میرے گرد کاغذ بنفشی ارغوانی سنگ مرمر کے نازک ستونوں کے ایک جنگل میں بدلنے لگا۔ شام کے صحراؤں میں اک ہجوم نخیل۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے نیم تاریکی میں ہزاروں بنفشی ارغوانی، سیاہ اور زرد کنول ایک غیر فانی شب کے خشک سکوت میں مڑھائے ہوں، ماند پڑتے جا رہے ہوں مگر ان کا رنگ پھیکا پڑنے کی بجائے مزید سرخ ہو رہا ہے۔ کنول کے اس کھلاتے ہوئے جنگل میں حسن بیمار کی سی دلکشی تھی جیسے پوری مسجد ایک خاموش اور ٹھنڈی آگ، سنگ مرمر کی آگ میں

جل رہی ہے۔ سب کچھ ختم ہو چکا ہے، مڑھ چکا ہے، سرد ہو چکا ہے مگر جل رہا ہے۔ اس میں مدت ہے حسنِ رفتہ کی۔ ستونوں کے اوپر کسی گھنے برگد کی طرح سرخ اور سفید دوہری محرابیں نیم دائروں کی صورت میں تاحہ نظر پھیلتی جا رہی تھیں۔ تو لنگ نے کہا تھا۔

”میں ایک بید کے درخت کی مانند ہوں۔

ہوا تم جاتے تو

میں ساکت کھڑا رہتا ہوں۔

اور اگر ہوا پیٹے تو

میں بھی حرکت میں آجاتا ہوں۔“

یہ ستون بید کے درختوں کی طرح ہوا کی غیر موجودگی میں پرسکون اور ساکت کھڑے تھے لیکن یوں لگتا تھا جیسے ہوا کے ہولے سے چلنے سے ہی سیمین کے معبد کی طرح منہدم ہونے لگیں گے۔ صحراؤں میں باد نسیم کے پیٹے جھونکے سے ہی ہجوم نخیل زمیں بوس ہو جائے گا۔

مسجد قرطبہ کو اپنی مرمریں ہتھیلیوں پر سہارا دینے والے اجسام خصوصی طور پر اس عمارت کے لیے نہیں تراشے گئے تھے بلکہ مسجد کا نقشہ ان قدیم ستونوں کی ساخت اور بندی کو مد نظر رکھ کر بنایا گیا تھا۔ انھیں تخلیق کرنے والے فنکاروں کے وہم و گمان میں بھی نہ ہو گا کہ ان کے تراشیدہ شاہکار صدیوں تک افریقہ کے رومی معبدوں اور کارتیج ایسے شہروں کے کھنڈروں میں دفن رہیں گے اور پھر امیر عبدالرحمن کے حکم پر انھیں کھود کر قرطبہ لے جایا جائے گا جہاں ان کے کندھیاں پر کسی معبد یا قصر شاہی کی بجائے ایک ایسی عمارت کی محرابیں اُٹھیں گی جسے دنیا کی سب سے بڑی مستقف مسجد ہونے کا امتیاز حاصل ہو گا۔ بادشاہی مسجد لاہور کے ۱۰۰ x ۲۱۵ کے مقابلے میں مسجد قرطبہ کا مستقف رقبہ ۶۲۰ x ۴۴۰ فٹ ہے۔

مسجد قرطبہ میں پچھلے کل ستونوں کی تعداد ۱۰۹۲ ہے اور ان میں سے ہر ایک کا رنگ
سنگ مرمر کی قسم اور نقش و نگار بالکل مختلف ہیں۔ گولائی تقریباً یکساں ہے بلندی
بارہ فٹ رکھی گئی ہے۔ چونکہ ان ستونوں کی اوسط بلندی مسجد کی مجوزہ چھت کی بلندی
سے کہیں کم تھی اس لیے ان پر دوسری محرابیں تعمیر ہوئیں اور ان پر قوسوں کے
گتے بنا کر چھت تک لے جایا گیا۔ تمام ستونوں کے زیریں حصے واضح طور پر مسجد
چمکیلے اور ٹائلم ہیں۔ گتے زمانے کے لاکھوں عقیقت مندوں کے کندھوں اور
ہاتھوں کے پُر تقدس لمس کا ثبوت!

میں ایک بھٹکے ہوئے آہر کی طرح حیران کھڑا تھا۔ سوئے حرم تو کیا میں
خود حرم میں تھا۔ کس سمت قدم بڑھاؤں تو منزل سامنے آئے گی؟ شاید یہی منزل
نہی ہی لیجیوہ کنڈی جو میری رُوح میں مچانس کی طرح اٹکی مجھے لاہو سے اس حرم پاک
تک پہنچ لائی تھی اب دھیرے دھیرے تحلیل ہو رہی تھی۔ یہ میری خوشنمختی تھی کہ
اس وقت سوائے میرے پوری مسجد میں اور کوئی سیاح موجود نہ تھا۔ کیا میں اس
عمارت کو صرف اور صرف ایک سیاح کی نظر سے دیکھ رہا ہوں؟ میں جو کہ ایک
گم گشتہ روح ہوں جسے علم کی روشنی نے راستہ دکھانے کی بجائے دوسروں اور
شکوہ کی بھول بھلیوں میں گم کر دیا ہے۔ اگر مجھے دنیا کے تمام مذاہب میں سچائی
کا پُر تو نظر آتا ہے تو صرف اس عمارت کی کشش مجھے اتنی دُور سے کیوں کھینچ
لائی ہے۔ میں سینٹ پیٹر زروم یا نوٹرے ڈیم پیرس کی جانب کیوں نہ چلا گیا؟
میں نے آہستہ آہستہ پتھر کی ان سلوں پر چلنا شروع کر دیا جن پر صدیوں
پہلے غلیفہ وقت بھی ننگے پاؤں چلتا تھا۔ لیکن میں نے اپنے دبڑوٹ اس
خیال سے نہیں اتارے تھے کہ اگر دوسرے سیاحوں نے دیکھ لیا تو کیا کہیں گے۔
اس روشن دماغ جدید انسان کا دماغ چل گیا ہے۔ ایک پرانی روایت کے کھنڈر
پر ننگے پاؤں چلنے سے اس کے پاؤں نہ چھل جائیں گے؟ زخموں سے خون نہ بہے گا؟

کھائے ہوئے کنول کا یہ گھنا جنگل ہمیشہ سے نیم تاریکی میں نہیں ڈوب رہا صبح کی
جانب اکیس محراب دار دروازے کھلتے تھے۔ یوں جس مقام پر ستون ختم ہوتے وہیں
سے ایک ہندسی توازن کے ساتھ کچھوڑوں کے درخت شروع ہو جاتے ستونوں
کی بجائے سیدھے تنے اور محرابوں کی جگہ کچھوڑ کے کھانڈا ریتے۔ عمارت کا باطن
صبح کے ظاہر سے ہم آہنگ ہو جاتا اور مسجد میں بیٹھے عبادت گزاروں و مفکروں
اور غالب علموں کی نظریں ستونوں کے جنگل سے پرے کچھوڑ کے درختوں کی قطاروں
تک ایک خوش نظر تسلسل میں چلی جاتیں۔ مخالفت سمت میں دریا کی جانب بھی کئی
محرابیں کھلتی تھیں۔ وادی الکبیر کے روال پانیوں میں متحرک پن چکیاں اور رومی
پُل یہاں سے صاف نظر آتے۔ وادیوں جانب القصر کی طرف متغدد دروازے
تھے۔ چند دروازے بائیں جانب سڑک پر بھی کھلتے تھے۔ لا محدود دستوں کی
حائل ایک ایسی بصری تصویر جو مینار مسجد، صحن، ستونوں کے جنگل، بازار اور
القصر کے علاوہ وادی الکبیر کے پانیوں پر بھی محیط تھی۔ مسجد کلیسا میں بدلی تو
یہ دستیں سمٹ گئیں۔ چاروں جانب کھلے دروازوں اور محرابوں کی آنکھیں انہیوں
سے پُر کر دی گئیں اور ان میں چھوٹے چھوٹے بھڑکیے چیل بنا کر ان کے اندر صلیبیں
اور پیرد فیروں کے مجسمے رکھ دیئے گئے۔ دن کے وقت تو قرطبہ کے روشن سورج
کی کرنیں جن کے آگے دیواریں حائل نہ تھیں مسجد کے گوشے گوشے کو منور کرتیں
اور جہنمی وادی الکبیر کے پانی شفقت سے سرخ ہونے لگتے دوسو اسی فائوسوں
میں آدیزال دس ہزار سے زائد شمعیں روشن کر دی جاتیں۔ فرش پر بیش قیمت تالین
نچھتے تھے اور چھت صحرائے قرطبہ کی منقش کڑی سے آراستہ تھی۔ ان دنوں اصل
چھت کی نشانیاں کہیں کہیں ملتی ہیں۔ بقیہ کڑی ادھیڑ کر سائوں کی ساخت کے
یہ استعمال ہوئی۔ عیسائیوں میں روایت تھی کہ اس دیدہ زیب کڑی سے بنی ہوئی
گٹار میں ہمیشہ ایک حزن آمیز سُر بجا پڑتا ہے۔ دوسرے روز جب میں مسجد کے

برآمدوں میں گھوم رہا تھا تو چھت کا منقش کمرہ افزش پر پڑا۔ پشت پر گئے کسی خاص مصالحوں کی وجہ سے ابھی تک بالکل درست حالت میں گھن سے پاک تھا۔

میکیکو کے گھنے جنگلوں میں پوشیدہ کسی انکا اہرام کے کمنڈر کی طرح مسجد کے قباب میں تعمیر کردہ، کلیسا ہجوم نیل میں یوں پنہاں تھا کہ پہلے پہل مجھے اس کی موجودگی کا احساس تک نہ ہوا۔ میرے ساتھ ساتھ چلتے ستون یوں سمجھ جیسے بنو اسرائیل کو راستہ دینے کے لیے نیل کے پانی سانس روک کر ایک دیوار کی صورت میں ساکت ہو گئے تھے۔ یہاں ستونوں کے اس دریا کے بیچ موسیٰ کے عصا کی بجائے عیسے کا کلیسا پھینک دیا تھا لیکن سنگ مرمر کے یہ پانی پیچھے ہٹنے کی بجائے کلیسا کے پلوؤں میں سے بہہ نکلنے کے بعد دوسری جانب پھر رواں دواں تھے میں بھی اس دیوار سے پہلو بچا کر المنصور کے حصے کی جانب چلا گیا۔ مسجد کے اندر دواں میں تعمیر کردہ ایک پیل کی سلاخوں کو تھامے ایک پادری نے اس ویران حصے میں میرے قدموں کی آواز سن کر سر اٹھایا اور پھر سینے پر صلیب کا نشان کھینچ کر اٹھ کھڑا ہوا۔

”کلیسا میں صبح کی سردی تو تمام ہو چکی میرے بیٹے۔ تم دیر سے پہنچے ہو۔“ اس نے انگلی کے اشارے سے ایک صلیب مجھ پر بھی لاد دی۔

”مقدس باپ! میں تو سیاح ہوں۔ مسجد کی زیارت کے لیے آیا ہوں۔ میں نے صلیب کے بوجھ تلے دبتے ہوئے کہا۔

”پھر تم بہت پہلے آگئے ہو۔ ہم اس مسجد کی..... اس کلیسا کی برقی روشنیاں تب تک نہیں جلاتے جب تک سیاحوں کی ایک معقول تعداد اندر نہ آجائے۔“ اس نے سر ہلاتے ہوئے کہا اور پھر گھمے میں ملکی وزنی صلیب کو مٹھی میں بیچ کر آہستہ سے بولا ”تم مقرر ہو؟“

دارت شاہ نے سرگوشی کی! سان ذات صفات تے مجیس کیا؟“

اور ان یوتانگ بھی مجھے مرتد بنانے کی کوشش میں مصروف تھا۔ سیاحت کا حقیقی مقصد اپنی ذات، پیشے، وطن اور مذہب کو فراموش کر کے ایک عام انسان بن جانا ہے۔

میں دارت اور یوتانگ کا کنا ماننے کو تھا کہ شاہ حسین فقیر ماننے نے فریاد کی۔ ”راہجن سائوں کٹھیاں پائیاں دل وچ لگیاں شور۔“ پچھی دانگوں میں پنی ترناں قادر سے ہتھ ڈور اور میں نے اقرار کر لیا۔ ”ہاں میں مقرر ہوں۔“

”افریقہ سے آئے ہو؟“ اس نے صلیب کو مٹھی سے آزاد کر کے ہاتھ چھنے کی جلیبوں میں اتار دیئے۔

”پاکستان.....“

”ہوں! مجھے نہیں معلوم تھا کہ وہاں بھی مقرر ہوتے ہیں.....“ اس نے سر ہلا کر مجھے اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کیا۔ آؤ میں تمہیں اس عمارت کا خوبصورت ترین حصہ دکھاؤں۔“

میں ایک فرمانبردار طالب علم کی طرح سر جھکا کر اس کے پیچھے ہر لیا اور ہم دونوں ستونوں کے بیچوں بیچ چلتے ہوئے مسجد کے ایک ایسے حصے میں آگئے جس کی چھت کڑی کی بجائے سفید پلستر کے شہتیروں سے بنی ہوئی تھی ستونوں سے اوپر گتھی ہوئی محرابوں کا ایک سلسلہ تھا جن پر دیدہ زیب ٹھولے نقش تھے ستونوں کے درمیان میں سے نیم تاریکی کے باوجود الحکم کی تعمیر کردہ محراب چمکتے پائے کی طرح یوں روشن نظر آرہی تھی جیسے پوری عمارت کا کافی روشنی کھج کر اس میں جذب ہو رہی ہو۔ اگر مجھے دنیا کی خوبصورت ترین مسجدوں کے درمیان مجبوری طور پر موازنہ کرنا پڑے تو شاید مجھے مسجد قرطبہ کو سلطان احمد استنبول، مسجد جامع ہرات اور مسجد گوہر شاد مشہد کے مقابلے میں ترجیح دینے پر تدریسے تاقی ہو مگر مسجد قرطبہ کی محراب الحکم میرے نزدیک دنیا کی تمام عمارتوں کے کسی بھی انفرادی حصے پر

بھی چچی کاری کا یہ شاہکار عیسائی کاریگروں کے کمال فن کا معجزہ ہے۔ شاہ قسطنطنیہ نے خصوصی طور پر اس محراب کی آرائش کے لیے پنتیس ٹن وزنی موزیک پتھر کے ٹکڑے الحاکم کو بطور تحفہ روانہ کئے تھے۔ موزیک کے ہمراہ ایسے کاریگر بھی آئے جو چچی کاری کی بازنطینی روایت کے ماہر تھے۔ اسی لیے نقش و نگار میں واضح طور پر بازنطینی رنگ جھلکتا ہے.....

”آپ درست ہی فرماتے ہوں گے“ میں نے خطِ کوئی کے الفاظ پر ہاتھ پھیرتے ہوئے مسامت سے پوچھا۔ لیکن کیا عیسائی کارگردوں نے یہ آیاتِ قرآنی بھی.....“

پادری نے مجھے اپنی بوڑھی آنکھوں سے یوں گھورا جیسے کہ رہا ہو ایک تو
میں تھیں مفت میں مسجد کی سیر کر رہا ہوں اور اوپر سے جرح کرتے ہو؟
”اُن دنوں عربی صرت مسلمانوں کی زبان ہی نہیں تھی۔ وہ میرے کندھے پر
ہاتھ رکھ کر دھیمے لہجے میں بولا ”ہسپانوی عیسائیوں کی بھی مادری زبان تھی..... ہاں
یہ ہو سکتا ہے کہ نقش و نگار بازنطینی عیسائیوں نے تخلیق کئے ہوں اور تھامس
قرآن کی عبارت موروں نے خود لکھی ہو۔ ویسے اس مسجد میں جو کچھ بھی تم دیکھ
رہے ہو اس کا صرف بیس فیصد حصہ اصل حالت میں ہے۔ یہ ساری عمارت
حکومت ہسپانیہ کی عنایت سے قائم ہے ورنہ کبھی کی کھنڈ رہ چکی ہوتی۔ خاص طور
پر فرش، چھتیں، باہر کے دروازے اور محرابیں ماہر تعمیر و لاسکر باسکو نے عمر بھر
محنت کر کے از سر نو تعمیر کرائی تھیں۔“

اپنے ناکافی علم کی بنا پر میں نے لاٹ پادری سے بحث میں الجھنا مناسب نہ سمجھا اور خاموشی سے اُس کی وہ رٹنی رٹائی تقریر سننے لگا جو شاید پچھلے پچاس برسوں سے وہ مسجد میں ہر آنے والے ستیاج کے سامنے اس انداز سے کرتا تھا جیسے ابھی ابھی اُس کے ذہن میں یہ تمام حقائق وارد ہو رہے ہوں۔

مناطی اور خوبصورتی کے لحاظ سے عادی ہے۔ سفید سنگ مرمر کے ستیل منقش مُصلے صورت و فرسش نیچے بہتے تھے۔ میرے راہبر پادری نے مُصلے کے قریب کبھی ایک اُدھ جلی موم بتی اُٹھا کر روشن کی اور محراب کے اندر داخل ہو کر اُسے بلند کر دیا۔ آیات قرآنی اور خوشنما نقش و نگار جو اس سے پیشتر ایک ٹھوس اور جامد صورت میں دکھائی دے رہے تھے۔ لاکھوں چھوٹے چھوٹے چمکتے دھکتے مختلف رنگوں کے پتھروں میں منتشر نہانے لگے۔ خطِ کوفی میں تحریر آیات قرآنی کا ایک ایک لفظ وال کے دانے جتنے سیکیڑوں چھوٹے چھوٹے پتھروں کے جوڑنے سے ظاہر ہوا تھا۔ پُر پیچ پُھول اور مرصع حاشیے بھی اسنی رنگا رنگ ٹکڑیوں کے باہم ربط سے وجود میں آئے تھے۔ موم بتی کی جھلقاتی روشنی میں ان کا سنرا رنگ سیکیڑوں برس گزرنے کے باوجود آنکھوں کو خیر و کیے دیتا تھا۔ چھت سے وہ خالی رسی لگے۔ رہی تھی جس کے سرے پر مسجد کا سب سے بڑا فانوس بندھا ہوتا تھا۔ یہیں پر ماہِ رمضان کے شروع میں وہ مجاری بھر کم موم بتی روشن کی جاتی جس کا حجم اتنا نپا تلا ہوا کرتا تھا کہ عین آخری رونے کے افطار کے وقت خود بخود بجھ جاتی تھی۔ پادری نے موم بتی کو ایک دائرے کی صورت میں حرکت دی۔ محراب میں سے شرائے چھوٹ چھوٹ کر بھرتے اور پھر اسی لمحہ سمٹ کر خطِ کوفی اور نقش و نگار میں جذب ہونے لگتے۔

”یہ سچی کاری کا یہ کام اس لحاظ سے دنیا بھر میں منفرد ہے کہ اس سے زیادہ
چھوٹے پتھر کسی اور عمارت کی تزئین کے لیے استعمال نہیں ہوتے۔
”کیا یہ موروں کے کمال فن کا معجزہ نہیں کہ بارہ سو برس پیشتر تعمیر کردہ اس
خراب میں سے ابھی تک سچی کاری کا ایک ٹکڑا ابھی نہیں اکھڑا.....“
”اکھڑتے رہتے ہیں.....“ اس نے موم بتی بجھا کر فرش پر رکھ دی لیکن
ہمارے آثار قدیمہ کے ماہر انھیں دوبارہ اُسی ترتیب سے جوڑ دیتے ہیں۔ بول

”عربوں کے زمانے میں مسجد اور شاہی القصر کے درمیان ایک زیر زمین گذرگاہ تھی جس کے راستے خلیفہ وقت یہاں نماز کے لیے آتا تھا۔ اسی محراب کے دائیں ہاتھ کا مصلیٰ خلیفہ کے لیے مخصوص تھا۔ بائیں جانب وزیر اعظم بیٹھا اور ان دونوں کے درمیان امام مسجد کے لیے جگہ ہوتی۔ وہ لوگ علم ہندسہ کے ماہر تھے۔ محراب کی چھت میں قوسیں، کماندارا بھرے ہوئے خطوط اور گرائیاں اس ہندسی ترتیب سے تعمیر کی گئی تھیں کہ خلیفہ وقت جب مُوروں کے مقدس دن جمعہ کا خطبہ پڑھتا تو اس کی آواز ان قوسوں سے ٹکرا کر گرائیوں میں اُترتی، دوچند ہو کر کماندار خطوط سے ٹھرتی اور پھر محراب میں متعدد بار گردش کرنے کے بعد کئی سو گنا بلند ہو کر باہر نکلتی اور پوری عمارت میں پھیل جاتی۔ مسجد میں موجود قوس ہزار سے زائد عبادت گزار چاہے وہ المنصور کے تھے میں ہی کیوں نہ بیٹھے ہوں۔ اس گونجتی ہوئی آواز کو بخوبی سن لیتے۔۔۔۔۔ اگر تم پسند کرو تو بے شک محراب کے اندر کھڑے ہو کر مُوروں کی طرح اذان دے کر بھر پور کرو۔۔۔۔۔“

میں یکدم چونک گیا۔

ایک چھ سالہ بچہ ننھے منے ہاتھ سینے پر باندھے مسجد تاجہ شاہ کی پٹی ہوئی چٹائی پر کھڑا آواز بلند نماز دہرا رہا ہے۔ زیر زبر کا فرق آیا، زبان انکی جھکنے میں تاخیر ہوئی اور امام مسجد کا لپکلا بید اس کی پشت پر بُری طرح برسے لگا۔ شدید اذیت اور جلتے ہوئے درد کے باوجود حکم نماز سے نیت توڑنا کفر ہے۔ وہ ہچکیاں بیٹا ہوا بھرائی ہوئی آواز میں نماز جاری رکھتا ہے۔ لہریز آنکھوں سے ٹپ ٹپ بہتے آنسو سینے پر باندھے ہاتھوں پر متواتر گر رہے ہیں۔ اس متشدد ابتدائی تعلیم نے اُسے ہمیشہ کے لیے مذہب سے خوف زدہ کر دیا۔ ذی شعوری کی عمر کو پہنچ کر بھی کسی مذہبی شخصیت کی موجودگی اُسے دہشت زدہ

”اور تم مُور ہو۔۔۔۔۔“ پادری کا پوپلا منہ حیرت سے لٹکا اور کسی کھر پڑی کے جبر سے کی طرح گھل گیا۔ میں نے سر جھکا لیا۔

”توسنو“ اُس نے صلیب کو چوما اور پھر ہونٹوں کے گرد ہتھیلیوں کا ہل بنا کر انتہائی عقیدت سے بلند آواز میں پکارنے لگا۔۔۔۔۔ اُ۔۔۔۔۔ اُ۔۔۔۔۔ آواز محراب کے اندر پتھر میں گھدے نیم دائروں سے ٹکرائی۔۔۔۔۔ قوسوں نے اس اُ۔۔۔۔۔ کو دوچند کر کے کماندار خطوط پر پھیلا دیا۔ پادری کا منہ پوری طرح کھل گیا۔ دسے۔۔۔۔۔ دسے۔۔۔۔۔ ماریا! چھت کی پیالہ نما گرائیوں میں ڈوب کر ”اُدسے ماریا“ کے الفاظ نیچے اُترے اور محراب میں سے نکل کر مسجد کے ایک ہزار ترانوے ستونوں کے گرد منڈلاتے ہوئے پوری عمارت میں گونجنے لگے۔۔۔۔۔ اُدسے ماریا! اُدسے ماریا!

جب ہنرمند کا آخری تاجدار مردان مصر کے ایک گاؤں میں تنہا منہ میں اپنی سفید ریش دباٹے عباسی سپاہیوں کی تلواروں کو اپنے عمر رسیدہ بدن پر دوک

رہا تھا تو اس کا بیس سالہ پوتا عبدالرحمن دریا سے فرات اور کوہ اطلس کے درمیان ایک معزور و غلام کی مانند عباسیوں کے سیاہ پرچموں کے سائے اور ان کے پُر شوق خجروں سے ہر اسان کسی ایسی پناہ گاہ کی تلاش میں سرگرداں تھا جہاں وہ اس خونی طوفان کے تھم جانے تک روپوش رہ سکے۔ پانچ سال کی سحرانوردی کے بعد ابلہ پادشاہ عبدالرحمن افریقیہ پہنچا جہاں اس کی ماں کے رشتہ دار بربر قبیلے نے اسے اپنی امان میں لے لیا۔ عبدالرحمن کی عقاب نظروں نے دیکھ لیا کہ سمندر پار کا اندلس اس کے لیے بزمِ امیہ کی کھوئی ہوئی سلطنت کا نعم البدل ثابت ہو سکتا ہے۔ وہ چند بربر قبیلوں اور اپنے غلام بدر کے ہمراہ اندلس کے ساحل پر اتر آیا اور فرما کر وائے اندلس یوسف الفہری کو ایسی شکست فاش دی کہ اس کے بعد ہسپانیہ کے جس حصے میں بھی نیزے پر بندھا عبدالرحمن کا سبز علم پرچم کی صورت میں افق پر ابھرتا دہاں کے تاجدار قریش کے اس عقاب کے جھپٹنے سے پیشتر ہی میدان چھوڑ کر فرار ہو جاتے۔ ورازدہ اکھرے بدن کا مالک عبدالرحمن جس کے ماتھے پر ہمیشہ سرخ بالوں کی دو ٹیکیں کھلتی رہتی تھیں پڑے ہسپانیہ کو زیر کر کے فزون لطیفہ کی طرف متوجہ ہوا۔ اس کی حسین ترین یاد و دشت میں واقع شاہی باغ رصافہ تھا جہاں وہ بچپن میں اپنے دادا ہشام کے کندھوں پر سوار ہو کر سیر کیا کرتا تھا۔ نئے اموی دار السلطنت کے مصافحات میں اسی نمونے پر رصافہ قرطبہ کی تعمیر ہوئی۔ یہیں پر عبدالرحمن نے اپنے ہاتھوں سے اندلس میں پہلا کجور کا درخت لگایا۔ اپنے کھوئے ہوئے دشت کی علامت اس صحرائی درخت کو دیکھ کر اس نے وطن سے دوری کی کسک کو جن اشعار میں ڈھالا وہ آج بھی زبان زدِ عام ہیں۔

رصافہ کی تعمیر سے بھی قرطبہ دمشق کے ہم پلہ نہ ہو سکا کہ دنیا کے اس قدیم ترین شہر میں ایک ایسی عمارت کھڑی تھی جس کے میناروں اور گنبدوں کی محبت امیر عبدالرحمن

الداخل کے اموی خون میں دوڑ رہی تھی۔ اس کے اسلاف کی یادگار مسجد اُمیہ! قرطبہ شہر کے درمیان وادی الکبیر کے کنارے ایک قطعہ زمین تھا جس کے سینے پر زمانے نے ہمیشہ ایسے درو دیوار بلند دیکھے جنہیں انسان نے ان دیکھی قوتوں کی عبادت کے لیے وقف کیا۔ سب سے پہلے قوطی مندر تعمیر ہوا۔ ہسپانیہ پر رومیوں کا غلبہ ہوا تو یہاں رومی معبد بنا دیا گیا۔ عیسائیت کی آمد پر اس کی جگہ کلیسا سینٹ وینسٹ کی عمارت کھڑی کر دی گئی۔ عبدالرحمن نے ایک لاکھ درہم کے عوض یہ قطعہ زمین عیسائیوں سے حاصل کیا اور مسجد اُمیہ دمشق کے مطابق نقشہ بنوا کر ۷۸۶ء میں خود اپنے ہاتھوں سے مسجد قرطبہ کی بنیاد رکھی۔ تعمیر کی ذاتی دیکھ بھال کی غرض سے وہ رصافہ کے کجوروں کے درختوں سے جدا ہو کر قریبی القصر میں آٹھرا اور روزانہ دو گھنٹے عام مزدوروں کی طرح مسجد کی تعمیر کے لیے ایٹھیں اور گارا اپنی پشت پر ڈھونٹا۔ اگرچہ مسجد اجمی تک مکمل نہ ہوئی تھی، مگر طرفِ طبع کے ڈھیر تھے۔ پستری گیلہ تھا نقش و نگار میں رنگ آمیزی باقی تھی کہ عبدالرحمن کے دل میں اس خیال کی جڑیں پھیلنے لگیں کہ اس کا رشتہ حیات منقطع ہونے کو ہے۔ چنانچہ حکمِ انتحار جاری ہوا۔ طبع کے ڈھیروں کو پردوں سے چھپایا گیا۔ نامکمل فرش پر تالین بچھائے گئے۔ سفید تفکان۔ سفید عبا اور سفید عمامہ میں لمبوس سرخ بالوں والے عبدالرحمن نے اسی محراب میں کھڑے ہو کر خطبہ و نماز کی ادائیگی کر کے مسجد قرطبہ کے باقاعدہ قتل کی سعادت حاصل کی۔ اس کے چند روز بعد ماروہ کے شہر میں عبدالرحمن وفات پا گیا۔ مسجد قرطبہ میں انکی غائبانہ نماز جنازہ ادا کی گئی۔ مسجد کی مزید توسیع مختلف ادوار میں ہوئی۔ ہشام اول نے مینار تعمیر کروایا۔ عبدالرحمن دوم نے محرابوں کی قطاروں کو دوچند کر دیا۔ الحکم نے پختیس ہزار درہم کی لاگت سے منبر و مقصورہ تیار کرایا۔ آخر میں سب سے بڑا اضافہ المنصور کے زمانے میں ہوا جب کہ مسجد کی

وسعت چار گنا کر دی گئی۔

پونے پانچ سو برس تک اس محراب سے اللہ اکبر کی آواز اس بے مثال حرم پاک میں گونجتی رہی جہاں اس وقت میرے سامنے ایک پادری منہ کھولے آئے ماریا کی صدائیں بلند کر رہا تھا۔ اسی شہرک مقام پر وہ خون آلود قرآن مجید رکھا ہوا تھا جس کی تلاوت کے دوران حضرت عثمانؓ شہید ہوئے۔ یہیں کھڑے ہو کر تادمی المنذ نے امیر اندلس کو محض اس غفلت پر کہ اُس نے نماز جمعہ مسجد قرطبہ کی بجائے اپنے محل میں ادا کی تھی سب کے سامنے خطبہ عام میں اتنی سخت تنبیہ کی کہ امیر اندلس کا چہرہ شرم و ندامت سے سرخ ہو گیا، تاریخ دان المقری نے مسجد قرطبہ کے طرز تعمیر اور حسن کے بارے میں پوری کتاب تصنیف کی۔

”آئے ماریا..... آئے ماریا!“ پادری کی وقت آمیز آواز محراب میں ایک بوڑھے گدھے کی طرح پھڑپھڑا رہی تھی۔

زمانے کے راسٹ کی مائل ہمیشہ حرکت میں رہتی ہے۔ اس پر بندھے خالی آنکھوں سے عین کنوئیں کے تازہ پانی سے لبالب بھر کر روشنی کی جانب مائل سفر ہوتے ہیں اور پھر خود بخود مائل کی حرکت سے بے اختیار دھوکہ جھکتے جھکتے اپنا اثاثہ کھو کر پھر خالی ہو جاتے ہیں۔ ۱۲۳۶ء میں مسلمانوں کی غفلت کا دواں پانی آنکھوں سے خالی ہو گیا۔ قرطبہ عیسائیوں کے ہاتھوں میں چلا گیا۔ مسجد کے چند ستون اکھاڑ کر بیچ میں حضرت مریم کا مجسمہ نصب کر دیا گیا۔ یہ صورت حال ۱۵۲۰ء تک قائم رہی اور مسجد کسی حد تک اصلی حالت میں موجود رہی۔ پھر قرطبہ کے چند پادریوں نے کارلوس پنجم کو قائل کر لیا کہ کیتھولک ہسپانیہ کے وسط میں مسلمانوں کا ایک معبد عیسائیت کی توہین ہے اس لیے اُسے مسمار کر کے یہاں ایک عظیم الشان کلیسا تعمیر کیا جائے۔ کارلوس نے جسے مسجد قرطبہ دیکھنے کا

اتفاق نہیں ہوا تھا اجازت دے دی۔ چنانچہ مسجد کے قلب کو پھوڑا گیا۔ سینکڑوں ستون اکھاڑ دیئے گئے۔ چھت کو اُدھیڑ دیا گیا۔ مسجد کا صرف وہی حصہ محفوظ رہا جو کلیسا کے نقشے میں شامل نہ تھا۔ خوبصورتی کی اس لاش پر انھوں نے اپنے کلیسا کی دیواریں اٹھائیں۔ ایک کو خست اور اوجھی عمارت نے گرد و پھیلے ہوئے ہجوم نخیل کو بادِ سموم کی طرح اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ کنول کا جنگل مڑ جھا گیا۔

کارلوس جب اپنے معماروں کا عظیم کارنامہ دیکھنے کے لیے اندر داخل ہوا تو مسجد کے نازک ستونوں کے درمیان دیوارِ اُدھیڑ دیکھ کر انتہائی پشیمان ہوا۔ اس نے رسمِ افتتاح ادا کرنے سے انکار کرتے ہوئے پادریوں سے کہا: ”اگر مجھے معلوم ہوتا کہ تم کیا کرنے والے ہو تو تم یہ کبھی نہ کر پاتے۔ کیونکہ جو کچھ تم نے یہاں بنایا ہے وہ کہیں بھی تعمیر کیا جاسکتا تھا اور جو کچھ تم نے تباہ کر دیا ہے وہ روتے زمین پر کہیں بھی دیکھا نہیں جاسکتا۔“ جیمز مشنر اس کلیسا کو ”عظیم بد صورتی“ کہنے پر مجبور ہو گیا۔ مٹن اُسے ایک ناقابلِ تلافی خرم قرار دیتے ہوئے لکھتا ہے کہ ”یہ گنداکلیسا ایک ناقابلِ یقین پاگل پن کا مظہر ہے۔ خود غنائی۔ دکھاوٹ اور بازاری پن کا مظاہرہ۔ ایک ایسی ظالمانہ قربانی، جو پادریوں نے اپنی مذہبی ہوس کی بھینٹ چڑھا دی۔ یہ عمارت کلیسا سے زیادہ ایک تجھبہ خانہ لگتی ہے۔“

”آوے ماریا..... آوے ماریا..... آوے ماریا..... آوے ماریا.....“

..... فنا..... فنا..... فنا! ”صداء محراب میں یوں پھڑپھڑا رہی تھی جیسے کسی تند خو عقاب کے گھونسلے میں ایک حیرت زدہ چڑیا داخل ہو جائے۔ سلطان محمد فاتح باز نطینوں کو شکست دے کر عیسائیت کے سب سے بڑے معبد سائنا صوفیہ کو مسجد میں بدل دیتا ہے اور آئے ماریا کی بجائے

اس کے گنبد سے اللہ اکبر کی صدا مکراتی ہے۔ مسلمان دمشق میں داخل ہو کر کھلیا غلام کے نصفت حصے کو مسجد قرار دے دیتے ہیں۔ کچھ اسی طرح مسجد قرطبہ میں اب اللہ اکبر کی بجائے اُسے ماریا کی صدا میں تاریخ کے عروج و زوال کا ایک لازمی حصہ ہیں جس پر انسانی جذبات کو کوئی اختیار نہیں۔ آنسو سے ہمیشہ پانی سے بھرے نہیں رہتے۔ ایک مرتبہ مابل کا چکر مکمل ہو جائے تو انہیں تھی دامن ہونا ہی پڑتا ہے..... اول..... اللہ اکبر..... وآخر..... اُسے ماریا..... فنا!

محراب کے گنبذ اندھیرے میں خرابیدہ پتھی کاری کے پتھر یک دم ستاروں کی طرح چمکے۔ چھت اور محرابوں کے دامن میں مخمخ قمقمے ایک ایک کر کے یوں روشن ہونے لگے جیسے گھنے جنگوں میں سورج کی پہلی کرن تیرتی چل باقی ہے۔ کلڑی کا چھلمک کھلا اور سیاہوں کا پھلار پلا کیروں اور سیاہی کتب سے لدا پھندا مسجد کے اندر داخل ہو گیا۔ بھیڑوں کے اس گھے کا چرواہا گاؤں ایک ستون پر ہاتھ رکھ کر بے دھیانی سے تاریخی تفصیل بیان کرنے لگا جیسے چوتھی جماعت کا بچہ بلا سوچے سمجھے لہک کر کوئی پہاڑ مٹاتا چلا جاتا ہے۔ پادری نے خاموش ہو کر پیچھے دیکھا اور اُس کے ماتھے پر ناگوار کی کیروں کی صورت میں کچھ گئی۔ ان سیاہوں کی آمد سے تقدس کا وہ بندھن ٹوٹ گیا جس نے ہم دونوں کو مختلف مذاہب سے متعلق ہونے کے باوجود اس عمارت سے یکساں جذباتی شدت کے ساتھ باندھ رکھا تھا۔ اُس نے میرے گم گم چہرے پر شکایت آمیز نظریں بچھائیں اور حسبِ عادت میرے سینے پر صلیب لا کر آہستہ آہستہ چلتا مسجد سے باہر نکل گیا۔

مردی کیروں کی گزاریاں ایک جھنجھلاقی ہونی جھنجھلاہٹ کے ساتھ گھوم رہی تھیں۔ کلک کلک..... مسجد کے ستونوں کو مقید کرنے کے لیے کیروں کے بٹن دب رہے تھے۔ وقفوں کے بعد فلش کی شگنی روشنی محرابوں اور ستونوں

کو نمایاں کر کے ان کا تقدس چھین لیتی۔ فضا میں ہاتھ لہراتا ہوا گاؤں مسجد کی خود ساختہ تاریخ کے ساتھ ساتھ اپنے گاہکوں کی تعریف طبع کا سامان بھی پیدا کر رہا تھا۔ اور اس قدیم پتھر پر کندہ عربی عبارت میں اللہ کی پرستش کرنے والوں کو جنت میں ایسی درجنوں عورتیں دینے کا وعدہ کیا گیا ہے جن میں سے ہر ایک برجی بارود اور صوفیہ لارین سے ہزار گنا خوبصورت اور متناسب جسم کی مالک ہوگی۔

”میں اسی وقت مسلمان ہو جاتا ہوں۔ ایک ٹمگنے قد کے سیاح نے اپنی نیوٹرل سٹے ہوئے نہایت سنجیدگی سے اعلان کیا۔ بس مجھے موروں کا خدا یہیں اسی جہاں میں برجی بارود عطا کر دے۔“

”آمین“ بقیہ ٹولی نے بشکل ہنسی ضبط کرتے ہوئے نعرہ لگایا۔

”المنصور نے ٹیکس بڑھا دیئے اور مسجد بھی بڑھا دی۔“

اس مرتبہ ایک امریکی نے اپنے اوپر مصنوعی بیہوشی طاری کر لی اور زریلیں بڑھایا۔ ”اوہ مائی گاڈ! کیا اُن دنوں بھی سٹیٹ ٹیکس ڈیپارٹمنٹ ہوا کرتا تھا۔“

”اور یہ ہے وہ جگہ جہاں کھڑے ہو کر موروں کا پادری اپنے اللہ کو آوازیں دیا کرتا تھا۔ یہ کہہ کر گاؤں ایک کان پر تھیلی جھا کر مصنوعی سنجیدگی سے ”اللہ اللہ“ چنچنے لگا۔ بھیڑیں اس تماشے سے بے حد محظوظ ہوئیں اور منمنانے لگیں۔ ان میں سے چند محراب کے اندر داخل ہو کر گاؤں کی رفاقت میں ”آلا۔ آلا“ کا کورس الاپنے لگیں۔

”اور جناب..... گاؤں نے اپنا دلچسپ مشغلہ منقطع کرتے ہوئے میرے قریب آ کر کہا کیا آپ ہماری پُر لطف سیر میں شامل ہونا پسند کریں گے۔ صرف تیس پیسے!“

میں نے صرف اُسے نظر بھر کے دیکھا۔ آنکھوں کی سُرخمی سے اُس نے میرا جواب پایا اور واپس چلا گیا۔

مسجد کا پچھلے متواتر کھلتا اور بند ہو رہا تھا۔ سیاحوں کی متعدد ٹولیاں اندر آ رہی تھیں۔ ہر شوبے فکر سے اور جذبات سے عاری چہرے تھے جو چار دیواری سے متصل شراب خانوں سے اُٹھ کر صرف اپنی گامد بک پر مسجد قرطبہ کے آگے دیکھ لی کے الفاظ کھنسنے کے لیے ادھر چلے آئے تھے۔ اُس کھلائے ہوئے کنول کے جنگل میں۔ ستونوں کے جھنڈ میں۔ ہجوم نخیل میں اب بھٹیروں کی حکمرانی تھی۔ کلک۔ کلک۔ غلیش غلیش

میں مسجد سے باہر جانے کے لیے پچھلے کے پاس پہنچا تو کواڑ کھلا اور وہ دراز قد عورت داخل ہو گئی جو پچھلے شب کیننگ کے سونگ پول میں رُوح کی طرح خاموشی سے تیر رہی تھی۔ وہ مراکو کے روایتی لباس لیے سفید چٹے میں ملبوس تھی۔ اُس نے سر اور چہرے کو ایک رُومال سے اس طرح ڈھانپ لیا تھا کہ گندمی رنگ کے کینوس پر صرف دو چمکدار اور خوبصورت آنکھیں حرکت کرتی ہوئی نظر آ رہی تھیں۔ ایسی سیاہ تیلیوں کی مانند جو انجانے میں شہد کی تہ پر بیٹھ جائیں اور پھر پاؤں چمٹ جانے سے بس پٹ پٹاتی رہیں۔ مجھے یوں مقابل پاکر وہ طہر بھر کے لیے رُکی۔ اس کی آنکھوں میں عجیب قسم کی وحشت جھلک رہی تھی۔ الپس کے کسی بُند اور دروازہ گادوں کی طرح جو حسنِ فطرت کا شاہکار ہونے کے باوجود اپنی دیرانی اور سنائے سے دل میں ایک سرد خوف بھردیتا ہے۔ بوڑھی خادِم حسبِ معمول چڑے کا تھیلہ دونوں ہاتھوں میں مضبوطی سے پکڑے اُس کے پہلو میں کھڑی تھی۔ اُس نے جھک کر عورت سے کچھ کہا اور وہ دونوں معدوم ہوتی ہوئی گونج کی طرح مسجد کے ستونوں میں گم ہو گئیں۔

صبح مسجد میں اب خوب رونق تھی۔ نازکیوں اور سرد کے درختوں تلے مسجد کے نواحی علاقوں میں کام کرنے والے مزدور دوپہر کے کھانے کی ٹولیاں

پھیلائے خوش گپیوں میں مصروف تھے۔ فوارہ زیتون کی دھار کے نیچے ایک ٹکا دھرا تھا اور منڈیر پر بیٹھی ایک بڑھیا تالاب میں ڈبکیاں لگاتے متعدد بچوں کو چھینے اڑانے پر سرزنش کر رہی تھی۔ ٹکٹوں کی کبین کے گرد سیاحوں کا ہجوم تھا۔ محافظ کا ہاتھ رقم دبوچ دبوچ کر ٹکٹ جاری کر رہا تھا۔ مسجد کی زیارت سے فارغ ہوجانے والے سیاح ادھر ادھر بچوں پر براجمان تصویر پر پوسٹ کارڈوں پر اپنے تاثرات قلمبند کر رہے تھے۔ صبح کے طویل برآمدوں میں ایک ہسپانوی جوڑا بہت دیر سے چھت کے نقش و نگار سراہنے کے بہانے کسی ایسے کونے کی تلاش میں تھا جہاں وہ مغل ہوئے بغیر عبادتِ عشق کے ابتدائی مکالمے سکون سے ادا کر سکے۔ بڑھیا کا ٹکا لبریز ہوا تو میں نے فوارہ زیتون کی ٹھنڈی دھار سے اپنے تھمتے چہرے کو تروتازہ کیا اور پھر باب التوبہ سے باہر آ گیا۔

صبح کے عکس چار دیواری کے گرد لیشی ٹرک سنسان پڑی تھی۔ باب التوبہ کے پہلو میں عبدالرحمن سولم کی یاد میں ہسپانویوں کے تعمیر کردہ پتھر سے چوڑے پر ایک چیل بیٹھی ہوئی تھی۔ قریب پہنچنے پر اس نے پچھلائے اور ایک ہی اڑان میں مینارِ مسجد کی چوٹی پر سینٹ دانیل کے سر پر جابراجمان ہوئی۔ یادگار سے پرے دیوار کی گود میں پھولوں کی کمزادی مریم کا چیل دکھائی دے رہا تھا۔ بی بی مریم کے پاؤں میں سوکھے ہوئے پھولوں کا ایک ڈھیر تھا۔ میں نے پوری عمارت کی وسعت کا اندازہ لگانے کے لیے دیوار کے ساتھ فٹ پاتھ چلنا شروع کر دیا۔ بائیں ہاتھ پر دستی مصنوعات کی دکانیں تھیں جن میں سے بیشتر کے دروازوں پر قبیلے کے لیے بند ہے کی تختیاں لٹک رہی تھیں۔ ان سے پرے مورش طرز تعمیر کی حویلیوں کی چھتوں پر شاہی القصر کے سنگلاخ درو دیوار کے سائے تھے۔ میں دیوار کے جس حصے کے قریب چل رہا تھا اس میں جابجا وہ بند دروازے دکھائی دے رہے تھے جو پہلے القصر کی جانب کھلتے تھے۔ مسجد کے اندر چمکان

تھی کہ اس کے پہلو میں دریا مٹے راوی بہتا تھا، اسی طرح مسجد قرطبہ کی اس بلند دیوار کے ساتھ ان دونوں وادی البکیر کے پانی ڈال تھے۔

انسانی جسم کی ضروریات اگر متوازن طریق سے پوری ہوتی رہیں تو وہ ایک بے دام غلام کی طرح آپ کی خواہشوں کا ساتھ دیتا ہے مگر آج صبح سے روحانی غذا کا پلا پکڑیوں ٹھکارہ ہمارے جسمانی غذا کی ضرورت ذہن سے تو اتر گئی لیکن مانگوں نے اس کی فراہمی کے بغیر نفوس کش گمنا کا مزید طواف کرنے سے صاف انکار کر دیا۔

”کو ریڈا“ کی چھت سے ہسپانیہ کے دیگر قہرہ خانوں کی مانند گرم سالوں سے محفوظ شدہ سٹوروں کی تھو تھنیاں اور گرانڈیل رانیں ٹھک رہی تھیں۔ ڈاک کے ٹکٹوں کی طرح بل فائلنگ کے پرنے پر سٹر بھی نوادرات میں شمار ہوتے ہیں۔ یہاں شیلی دیواروں پر چسپاں پوسٹر خاں جنگی سے پہلے کی بل فائلنگ کا اعلان کر رہے تھے۔ کاؤنٹر کی سطح پر دستک سے قہرہ خانے کا مالک بڑا کر اٹھ بیٹھا۔ وہ چند کرسیاں جوڑ کر ان پر حالت قبولہ میں دراز تھا۔ غنہ کے مزوں میں اچانک مدخلت پر اس کے چہرے پر جو ناگواری ظاہر ہوئی وہ ایک گاہک کا چہرہ دیکھ کر فی الفور باطن میں جذب ہو گئی اور اس نے حسب منشا مجھے گاڑ پاپا چوسپ کا پیالہ اور ایک لمبی ڈبل روٹی مہیا کر دی۔ کھانے سے نارغ ہو کر میں نے ڈائری کے اوراق پر اپنے تاثرات اُتارنے کا عمل شروع کیا مگر قہرہ خانے کی سکون آمیز نیم تارک فضا مجھ پر غالب آئی اور میں وہیں چپکے ہوئے صوفے پر ناخنیں پھیلا کر اُد گھنے لگا۔ جب آنکھ کھلی تو چھت سے ٹکے بانور سگریٹ کے دھوئیں میں ڈوبے نظر آئے۔ انگلستان کے دیہات کی کمر آؤد صبح میں ٹھسٹرتے مویشیوں کے کسی گھٹے کی طرح۔ قہرہ خانہ کچا کچھ بھرا ہوا تھا۔ میں نے کاؤنٹر پر کھڑے ہو کر گرم گرم کافی کے چند گھونٹ بھرے

دروازوں کے پیچھے چیل تنگ کر دیئے گئے ہیں۔ اس لیے ان کی بناوٹ کا اندازہ صرف باہر سے ہی ہو سکتا ہے۔ ان میں سے ایک آدھ کے سوا باقی تمام دروازے ابتدائی نقشے کو سامنے رکھ کر از سر نو تعمیر کئے گئے ہیں۔ پورٹا اوکسینڈل کی زیبائش نو بالکل حال ہی میں ہوئی ہے۔ البتہ پورٹا استبان اس لحاظ سے منفرد ہے کہ یہ دروازہ ابھی تک ابتدائی حالت میں قائم ہے۔ سرخ و سفید نعل نما محراب کے دونوں طرف جالیاں ہیں۔ کہیں کہیں پیچیدہ نقش و نگار کی حامل پتھر کی سلیں ہاتھ لگانے سے یوں لڑتی ہیں جیسے قدامت کا یہ بوجھ اب ان سے زیادہ دیر نہ اٹھے گا۔ پسترا کھڑ چکا ہے اور سلوں کے درمیان منہ کھولے شگافوں میں سے خود رو گھاس جھانک رہی ہے۔ ہر سال بارش کا پانی ان شگافوں کو مزید گہرا کر دیتا ہے اور اس عمارت میں استعمال ہونے والی سرخ مٹی گھل گھسل کر وادی البکیر کے پانیوں میں جاملتی ہے۔ ایک اور دروازہ پورٹا اورینٹل اس سے بھی زیادہ شکستہ حالت میں ہے۔ پستری کی غیر موجودگی میں سرخ اینٹیں ایک ڈھانچے کی ہڈیوں کی طرح عمارت کے جسم میں سے ابھری ہوئی ہیں۔ میں نے ایک دراڑ کی مٹی کریدی اور دو تین اینٹیں بھر بھرے پستری بارہ سو سالہ رفاقت سے جدا ہو کر میرے قدموں میں گر گئیں۔ مجھے خیال آیا شاید انہی تین اینٹوں کو امیر عبد الرحمن نے خود دیوار پر جمایا ہو، ان کے درمیان اس سرخ مصالحے کی تہ اپنے ہاتھوں سے ہموار کی ہو۔ میں نے جیب میں سے رو مال نکال کر پوٹوں سے چٹے سرخ ڈرے یوں صاف کئے جیسے ارتکاب جرم کے بعد شواہد مٹائے جاتے ہیں۔ رنگ اتنا شوخ تھا کہ سفید رو مال لہو لہان ہو گیا۔ مسجد کا جو حصہ وادی البکیر کی جانب ہے اس کی دیوار بقیہ چار دیواری سے تین گنا اونچی ہے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ جس طرح بادشاہی مسجد لاہور کی شمالی دیوار اس لیے زیادہ گہری رکھی گئی

اور جہل ادا کر کے باہر آگیا۔

مذہب ڈھل چکا تھا۔ باب التوبہ بند ہو چکا تھا۔ ایک پادری پھروں والی مریم کے آگے گھجکا موم بتیاں روشن کر رہا تھا۔ دیوارِ مسجد کے سائے میں آراستہ پیراستہ گھجیوں کی ایک قطا تھی۔ گجھتی بان جو کُل فائٹروں کے بھڑکیے لباس میں جکڑے ہوئے تھے، گھوڑوں کی باگیں تھامے قریب سے گزرتے ہرستیاج کو قرطبہ کی خوبصورت ترین گجھتی میں سوار ہو کر عرب مٹنے کی سیر کی دعوت دے رہے تھے۔ دستی مصنوعات کی دکانیں بھی کھل چکی تھیں۔ عربوں کے عہد میں قرطبہ نے چمڑے کی صنعت میں اتنا عروج حاصل کیا کہ چمڑے کو صرف ”قرطبہ“ کے نام سے پکارا جانے لگا۔ یہ لفظ آج بھی مستعمل ہے۔ مسجد کے سامنے اُن دکانوں میں زیادہ تر ”قرطبہ“ سے بنی ہوئی مصنوعات فروخت ہوتی ہیں۔ میں دیوارِ مسجد کے سائے میں دریائے وادی الکبیر کی جانب اُترنے لگا۔ پوزٹا اور خیل میں سے اُکھڑی ہوئی وہ سُرخ اینٹیں ابھی تک فٹ پاتھ پر پڑی تھیں جنہیں آج دوپہر میرے بس نے اُن کے قدیم مسکن سے جُدا کر دیا تھا۔

مسجد کی شمالی دیوار کے قریب پوزٹا دل پڑھنے کی بُند مگر بدصورت رومی محراب
مگرے پائین کے دریا " وادی الکبیر کے کنارے کھڑی تھی۔ یہ محراب اُس
رومی پُل کے نکتہ آغاز پر واقع ہے جسے ہشام نے نابارون (فرانس) کی فتح کے
بعد مالِ غنیمت سے از سر نو تعمیر کیا تھا۔ پُل کی رسم افتتاح کے موقع پر ایک
فقیر نے الزام لگایا کہ چونکہ اُس سے پیشتر ہشام کو شکار کے لیے شہر سے باہر
نکلنے کے لیے ایک دُور افتادہ پُل تک جانا پڑتا تھا اس لیے اُس نے القصر
کے سامنے یہ پُل رعایا کی بہبود کی بجائے صرف اپنے ذاتی فائدے کی خاطر بنوایا
ہے۔ ہشام نے فقیر کے الزام کا جواب یوں دیا کہ پوری زندگی اس پُل پر قدم نہ
رکھا..... بہر حال میں نے اس پُل پر قدم رکھا۔ پُل کی دیوار پر الیسا وہ سینٹ رافیل

کے مجھے تلے جلتی موم قبوں کی روشنی میں پیتا دادی الکبیر کی سپہائیوں میں جھانکتا دوسرے سرے پر پہنچا جہاں قلعہ ہو رہا نام کا ایک حفاظتی برج کھڑا ہے۔ عرب عہد کے اس خوشنما برج میں ان دنوں کوئی اہم قسماً کا عجائب گھر قائم ہے۔

میں قلعہ ہو رہا سے گزر کر دریا کے کنارے کنارے ایک نیم پختہ ویران سڑک پر ہر لیا جس کے دائیں جانب اُجاڑ ٹیلوں پر گھاس مچونس اور خاردار بھاریاں اُگی ہوئی تختیں اور بائیں طرف دریا کا حفاظتی بند تھا۔ تھوڑی دُور چلنے کے بعد میں دریا کی سطح تک باقی سیڑھیوں سے نیچے اُترا اور ریتیلے کنارے پر بیٹھ کر گریٹ سلگ لیا۔ شام کے دھندلے میں قرطبہ کے بام دور از منہ وسطیٰ کے کسی شہر کی طرح دکھائی دے رہے تھے۔ اس کی قدیم عمارتوں پر شفق ایک سرخ بادل کی طرح اُٹھ کر ٹھہری ہوئی تھی۔ بارہ سو برس پیشتر اگر کوئی کاروان سر شام شہر کے قریب پہنچتا ہو گا تو دھندلے میں مدھم مدھم روشن قرطبہ اسی طور ایک ساکت تصویر کی صورت دکھائی دیتا ہو گا۔ دریا میں پانی کی کمی کی وجہ سے سطح پر چھوٹے چھوٹے جزیرے اور ٹاپو اُبھرے ہوئے تھے جن پر جنگلی جھاڑیوں کے پہلو پہلو درجینا اور پنک کے پھول بھی دکھائی دے رہے تھے۔ ایک جزیرے پر چند عورتیں دن بھر کے دھوئے ہوئے کپڑوں کو اکٹھا کرنے میں مصروف تھیں۔ ایک بچہ پانی میں ہاتھ ڈالے تھے سنگریزے تلاش کر رہا تھا۔ حسبِ منشا کوئی گول پتھر ہاتھ آتا تو وہ اُسے بڑے اہتمام کے ساتھ اپنی ماں کے ہاتھ میں تھما دیتا جیسا کہ اس کی نظر بچا کر واپس پانی میں پھینک دیتی۔ جزیروں کے درمیان رواں پانیوں میں کبھی کبھار کوئی مچھلی اُچھلتی۔ شفق کی زد میں اُتے ہی سورج ہو جاتی اور پھر فضا میں تیرتی ہوئی شراب سے نیچے گر جاتی۔ جا بجا اُبھرے جزیروں کو چھوٹا ہوا دریا کا آہستہ رو پانی شام کے سکوت میں ایک متواتر سرسراہٹ کو جنم دے رہا تھا۔ ایک مدھم سرسراہٹ جو زریاب کے نفوں کی

طرح فضا میں پھیل رہی تھی۔

اردن الرشید کی ایک محفل میں جب نوجوان زریاب نے سر کی دیوی کو یوں زیر کیا کہ اپنے استاد اسحاق موصلی کو بھی پیچھے چھوڑ گیا تو اسحاق کے قہر سے بچنے کی خاطر اس نے بغداد کو چھوڑنے میں ہی عافیت جانی۔ عبدالرحمن سوم بذات خود فضیل قرطبہ کے باہر اس کے استقبال کو آیا۔ شاہی محل کی چابیاں دس روز کے لیے زریاب کے حوالے کر دی گئیں تاکہ وہ اتنے طویل سفر کے بعد مکمل آرام کرے اور تازہ دم ہو کر دربار میں اپنے فن کا مظاہرہ کرے۔ زریاب نے فن موسیقی کے علاوہ اندلسی رہن سہن کے آداب کو بھی نئی تہذیبوں سے روشناس کیا۔ اس نے کپڑے کی بجائے چمڑے سے تراشیدہ دسترخوان اور دھات کی بجائے چینی کے ظروف کو فروغ دیا۔ اُسے اپنے زمانے کا فیشن ڈیزائنر کہہ سچے اور بھی کہہ سچے جو موسم بہار اور موسم سرما کے اوائل میں آئندہ چھ ماہ کے لیے بالوں کے نئے سٹائل اور لباس کی جدید وضع قطع کا اعلان کرتا تھا جو پورے اندلس میں رواج پا جاتے۔ زریاب کے حافظے کا یہ عالم تھا کہ اُسے دس ہزار سے زائد غزلیں زبانی یاد تھیں۔ اُس کی دونوں ٹڈیوں غزالاں اور ہندلنے صرف اس لیے شہرت پائی کہ وہ ان شعروں کو لکھنے پر مامور تھیں جو حالت خواب میں زریاب پر وارد ہوتے تھے۔

جزیروں اور ٹاپوؤں کے درمیان تین آسیب زدہ پن چکیاں یوں براجمان تھیں جیسے چند دیو زاد پرندے سستانے کی خاطر پانی میں اترے اور پھر اُن کے پاؤں ریت میں دھنس گئے۔ ان بوسیدہ پن چکیوں میں سے صرف ایک کی چرخ تانم ہے مگر آنکھوں سے خالی جیسے انور کے خوشے سے دانے اتر جائیں تو وہ بے نام ہر جاتا ہے۔ مدتوں ان پن چکیوں نے وادی الکبیر کے پانیوں سے قرطبہ کے پاتیز اور باغوں کو سیراب کیا۔ پھر چرخیاں تھم گئیں تاریخ کی ہانک

گئی۔ آنکھوں سے پانی سے خالی ہو گئے۔ ان میں سے ایک کو جو غالباً القصر کے سامنے سے تافنی دلی محمد نے رواں حالت میں دیکھا تھا مقامی باشندے ان پن چکیوں کو مالیز کے نام سے پکارتے ہیں۔

میری بلائند ڈیٹ قرطبہ آنے مجھے مایوس نہیں کیا تھا۔ دریا کے پار اس بزرگ شہر کے افقی خطوط کے حسن کی اوس دھیرے دھیرے پیاس کے بھانبر کو سرد کر رہی تھی۔ مجھ سے کچھ فاصلے پر لب دریا ایک مورکش پن چکی کی شکستہ عمارت دکھائی دے رہی تھی۔ تجسس نے میرے قدموں کو ٹوکا دیا اور میں ایک ایسی پتھریلی گپڑندی پر ہو گیا جس کے اختتام پر پن چکی کے پیٹ میں نصب ایک اودھ کھلا کو اڑ نظر آ رہا تھا۔ یہ راستہ پن چکی سے پانچ چھ گز اوجر ہی ختم ہو گیا۔ درمیان میں ایک مختصر ٹکڑے پر پانی رواں تھا۔ میں نے اپنے ٹوٹ آتا کر بغل میں دلبے۔ پتھری گھٹنوں تک اوپر چڑھائی اور وادی الکبیر کی اس شاخ کو عبور کر کے منزل مقصود تک پہنچنے میں کامیاب ہو گیا۔ گرم خوردہ کو اڑا تھ لگاتے ہی کھل گیا۔ میں نے اندر بھانکا۔ آنکھوں سے خالی ایک طویل مائل کسی مردہ اژدھے کی مانند ایک دیوہیکل چرخنی پر ٹکی ہوئی تھی۔ خستہ سیڑھیاں سرکتی ہوئی نیچے گہرائی تک جا رہی تھیں۔ پہلے خیال آیا کہ اے برادر! ایک تو اوجر مسجد قرطبہ کی دیوار کا ایک حصہ ڈھا کر چلے آئے ہو اور اب اگر اس سیڑھی پر قدم رنجہ فرماؤ گے تو شاید اس عمدہ رفتہ کی یادگار پن چکی کو بھی لے ڈوبو گے۔ پھر ڈھاکس بندھی کہ اگر یہ عمارت سیکنڈ ہین سے یونہی قائم ہے تو اب اس ناچیز کے گناہوں کے بوجھ تلے تو سمار سونے سے رہی۔ میں نے اندر قدم رکھا اور بے حد احتیاط سے سیڑھیاں اترنے لگا۔ پن چکی کی پچلی منزل میں سے شاید رومی پل کی جانب کوئی کھڑکی کھلتی تھی کیونکہ زیریں حصے میں ابھی تک سرخی مائل روشنی کا ایک مکڑا پناہ گزین تھا۔ ایک انتہائی ٹوٹی پھوٹی

کا استعمال ہسپانوی نازنینوں کا پسندیدہ سنگھار ہے۔ مجھے رہ رہ کر اس میکسین
ہیٹ کا خیال آ رہا تھا۔ وہ لڑکی کیمپنگ والی عورت کی مانند پراسرار تو تھی
مگر شام ڈھلے واوی البکیر کے کنارے ایک کھنڈر کی تر میں یوں اعتکاف میں
بیٹھنا میری سمجھ سے باہر تھا۔

جستجو کا اسفنج جو آج صبح پرندے کے پر سے بھی ہلکا تھا، تمام دن کھوج
کے پانیوں میں ڈوب رہنے کے باعث اب اٹھائے نہیں اٹھتا تھا۔ چنانچہ
کیمپنگ پہنچتے ہی میں نے تازہ دم ہونے کے لیے تالاب کا رخ کیا۔ راستے
میں مراکشی حسن کا خیمہ پڑتا تھا جو اپنے پرے خاندان سمیت ایک تالاب پر راجہ
کافی پینے میں مشغول تھا۔ ظاہر ہے مجھے بھی بٹھایا گیا۔ کافی اور سینڈوچوں سے
فادح ہو کر حسن بھی میرے ساتھ ہوا۔ تالاب کے قریب حسب معمول بچوں کی
جھونپڑی میں بوڑھی خادم سر جھکائے بیٹھی تھی۔ اس کی مالک سنگ مرمر سے تراشیدہ
کسی زندہ مجسمے کی طرح پڑ سکون پانی میں تیر رہی تھی۔ حسن کے لیے بڑھیا کے ہون
پر ایک خفیہ سی مسکراہٹ ابھری جو مجھے ہمراہ دیکھتے ہی ڈوب گئی۔ میں نے اپنا
تولید حسن کے حوالے کیا اور تالاب میں چھلانگ لگا دی۔ پانی کی پھیل جھوٹے
سنگ مرمر تک پہنچی تو اس کی سیاہ آنکھیں لہروں کے تلاطم کا پھیا کرتی تھیں
تک آگئیں۔ اس کی آنکھوں میں وہی مجھ کی وحشی چمک تھی۔ گردن تک آب
ہونے کے باوجود میرے جسم کے پودوں سے پسینے کے قطرے پھوٹنے لگے۔ مجھ میں
اس عورت سے آنکھیں ملانے کی تاب نہ تھی۔ اس اثناء میں کسی نامعلوم اشارے
کے تابع بڑھیا جھونپڑی میں سے نکل کر تالاب کے کنارے آچکی تھی اور اس
نے سفید لبادہ اس انداز سے آگے پھیلا رکھا تھا کہ تالاب سے نکلتے وقت
میں اس کا جسم نہ دیکھ پاتا۔ لبادہ اوڑھ کر اس نے بالوں کو جھٹکا اور خادمہ
کے ہمراہ اپنے خیمے کی جانب چلی گئی۔

بیشمی پر قدم رکھنے سے پیشتر میں نے دیوار کا سہارا لیا تو میری ہتھیلی کے برعکس
پلستر کی ایک تہہ اکھڑی اور پھر اس کے نیچے ایک سرسراہٹا ہوا چوکور پتھر کھسک
کر نیچے گر گیا۔ اس کے ساتھ ہی گہرائی میں سے ایک ایسی دلدوز نسوانی چیخ برآمد
ہوئی کہ میرا تو کھجور دل گیا۔ اگر شیرھویوں کی شکستگی کا خیال نہ ہوتا تو میں بلاشبہ
تلاشیں بھرتا ہوا پن چکی سے باہر نکل جاتا۔ میں کچھ دیر سو اس باختہ اُسی حالت میں
بُت بنا کھڑا رہا اور پھر ہمت کر کے نیچے جھانکا۔ پن چکی کی تہ میں واوی البکیر
کی سطح کے متوازی ایک کھڑکی کے قریب جہازی سائز کے میکسین ہیٹ کو تھیل
میں تھامے ایک لڑکی انتہائی سراپگی کی حالت میں اُپر دیکھنے کی کوشش کر
رہی تھی۔ ہیٹ پر رکھی انگلیاں دہشت سے لرز رہی تھیں اور اس کا چہرہ
شفق کی سُرخ روشنی میں بھی زرد نظر آ رہا تھا۔ دیوار میں سے کھسکا ہوا بلکہ کھسکایا
ہوا بھاری پتھر اس کے بالکل قریب پڑا تھا۔ یعنی میں سنگساری کا مرتکب ہوتے
ہوتے بچا تھا۔

”سوری“ میں نے ہاتھ ہا کر افسوس کا اظہار کیا اور کسی غیر مناسب جواب کا
انتظار کیے بغیر ایک مغرور مجرم کی طرح چپکے سے باہر نکل آیا۔

کیمپنگ میں نسل جانے والی بس میں زیادہ تر قرطبہ عورتیں سوار تھیں جن کی
قربت میں مجھے یوں محسوس ہوا جیسے اپنے آبائی گاؤں جو کالیاں کی کسی شادی
میں شرکت کر رہا ہوں۔ نذر امیراٹی چنبیلی کے تیز عطر کا ”تونا“ چنگی میں دبائے
چوہدریوں کے کھدر کے گرتوں کو عطر بیز کر کے لاگ وصول کر رہا ہے۔ بھاگ
لگے رہیں..... میرے کرتے پر بھی ٹوٹنے کا وار ہوتا جس کے نتیجے میں اگلے کئی روز
تک میں زکام میں مبتلا رہتا۔ قرطبہ کی بس میں مجھے جو کالیاں یوں یاد آیا کہ ان
خواتین نے نہایت فراخ دلی سے اسی قسم کا جھٹکا چنبیلی کا تیز عطر اپنے فراخ
جسموں پر چھڑک رکھا تھا۔ چنبیلی کی تیز خوشبو اور آنکھوں کے گرد نیلے میکاپ

واللہ! مستنصر باللہ

مسجد قرطبہ کے چکر مینار کے اندر گھٹا ٹوپ تاریکی جتنی رحمان بھی نہ ہوتا تھا کہ باہر سفید و صوب کا سیسہ پگھل رہا ہے۔ آنکھیں گیلی ٹھنڈک محسوس کرتی ہیں اور ٹھنڈی مٹی سی زنگ آلود خوشبو قدامت کا پیام دیتی ہے۔ یہاں بادشاہی مسجد کے مینار کی طرح جا بجا مستطیل سوراخوں میں سے نکلتے ذروں کی مدھم ٹوٹی کے شہتیرائی میں نہیں اترتے۔ نیچے آتے لوگوں کی گفتگو کی گونج خاموشی کے تسلسل میں حائل نہیں ہوتی۔

قیام قرطبہ کے دوران میں صبح شہر کے قدیم حصوں کی آوارہ گردی میں گزرتی دہریہ کو سورج کی تپش ذکو میں روپوش کسی قومہ خانے میں پناہ لینے پر مجبور کر دیتی جہاں اس کتاب کے لیے نوٹس تیار ہوتے اور پچھلے پہر جہاں کہیں بھی ہوتا قرطبہ کے کھسے آسمان پر مینار مسجد کو تلاش کر کے اس سمت چل کھڑا ہوتا۔ درون مسجد جانے سے پیشتر باب التوبہ کے پہلو میں واقع ایک مختصر دروازے کو اس امید پر آہستہ سے دھکیلتا کہ شاید آج قسمت یاد دہی کرے، دروازہ کھلا ہوا اور میں میٹر حبیاں طے کر کے مینار کی چوٹی تک جاسکوں اور پھر ہمیشہ اسے اندر سے مقفل پا کر سن میں کسی کجی کے درخت تلے اپنے کپڑوں کا تھیلہ سرانے رکھ کر سو رہتا۔ پیشتر شاہیں حسن کی رفاقت میں کیمپنگ کے سونگ پول کے کنارے بسر ہوتیں۔ آج جب حسب معمول چوری چھپے دروازے کے قریب پہنچا تو دونوں کواؤں منتظر

باہر کی طرح کھلے تھے.....

پہلی منزل کی بالکونی سے صحن مسجد یوں نظر آتا ہے جیسے کسی بساط پر کھجور اور زیتون کے سرسبز مہرے رکھے ہوں۔ تیسری منزل پر پہنچا تو میرے سر پر قد آدم گھڑیاں، لوہے کے کنول اور اندھے جھول رہے تھے۔ ان کے اوپر قرطبہ کا چوکیدار سینٹ رافیل تنہا کھڑا تھا۔ اسی جگہ پر خلیفہ الناصر نے سونے کے بنے ہوئے ٹیے ٹیو نصب کروائے تھے جو ہوا کے چلنے سے گردش میں آجاتے تھے مجھے یاد ہے جب ہمارے گاؤں کی کچی مسجد کو از سر نو پختہ تعمیر کیا گیا تھا تو ایک مقامی لوہار نے چاندی کے ٹیو بنا کر میناروں پر نصب کئے تھے۔ کتنی عجیب بات ہے خلیفہ الناصر اور پاکستان کا ایک دیہاتی لوہار وقت اور فاصلے کی گہری خلیج کے باوجود انہماک عقیدت کے لیے ایک ہی طریقہ اپناتے ہیں۔ ایک طرف تو صحن مسجد تھا اور دوسری جانب میرے قدموں میں پرانے شہر کی دلاویز سڑک چھتیں دھوپ میں چمک رہی تھیں۔ چھتوں کے اس سڑک سمندر میں خوبصورت پاتو سرسبز جزیروں کی طرح بکھرے ہوئے تھے۔ فصیل قرطبہ کے باہر شہر جدید کی ڈربہ نما عمارتیں تھیں اور پھر ان سے پرے پرے شہر پر ایک آسیب کی طرح سایہ کیے ہوئے۔ سیر امور نیا..... موروں کے رنگ کا پہاڑ..... کالا پہاڑ! بائیں ہاتھ پر القصر تھا جس کی کھڑکیاں سیرامورنیا کی جانب کھلتی ہیں۔ انہی میں سے ایک کھڑکی کے سامنے کھڑی معتد کی ملکہ میکیک کی حسین آنکھیں اس کا سہ پہاڑ کی بد صورتی پر بھرائیں اور اس نے کواڑ بند کرتے ہوئے کہا: "معتد! موسم بہار میں قصر اشبیلیہ کی محرابوں میں سے مجھے سفید برف پوش وادیاں نظر آتی تھیں، اور قرطبہ میں یہ بد صورت اور کالا پہاڑ میری نظروں کے سامنے آتا ہے۔"

معتد نے پورے سلسلہ سیرامورنیا پر باداموں کے درخت گھرائیے اور اگلے موسم بہار یہ کالا پہاڑ بادام کے شگوفوں سے ایسے ڈھک گیا جیسے ابھی ابھی

اُس نے ایک کلاسیکی رقصہ کے انداز میں گردن جھٹک کر چہرہ اُگے کیا۔
 انہیں میچ کر مجھے استثنائی غصے سے دیکھا جیسے پہچاننے کی کوشش کر رہی ہو اور
 پھر کیمرو کیس میں اُس کو سیڑھیوں سے نیچے اتر گئی۔ میں نے اطمینان کا ایک گہرا
 سانس لیا اور اپنے اوپر سایہ فگن سینٹ رافیل کے مجسمے کی جانب نہایت عقیدت آمیز
 نظروں سے دیکھا جس نے فی الحال مجھے رُسا ہونے سے بچا لیا تھا۔ یقیناً وہی
 نیم کر یک محترمہ تھیں جو اُس شب پن چل کی تہ میں مراقبے میں بیٹھی ہوئی تھیں اور
 میرے ہاتھوں ترسنگ ہونے سے بال بال بچی تھیں۔ میں نے شکرانے کے طور پر
 مہربان پیر رافیل کی ایک تصویر کھینچی اور ایک محفوظ حفاظتی وقفے کے بعد
 نیچے اتر آیا۔

میں ایک سیاہ ستون کے ساتھ ٹیک لگائے مسجد کے اس حصے میں بیٹھا تھا جو
 المنصور کا تعمیر کردہ ہے۔ آخر شب جنگلوں میں اُترنے والی گہری دھند کی طرح سیکڑو
 ستونوں کے گرد تاریکی بال کمرے سو رہی تھی۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے میں
 استنبول کے زیر زمین آبی محل میں کسی ساکت کشتی پر حُسن زدہ بیٹھا ہوں۔ صرف
 ستون پانی کی بجائے تاریکی میں ڈوبے ہوئے ہیں اور ذخیرہ آب پر چھت
 سے مسلسل ٹپکنے والے پانی کے جلتے گہک کی بجائے کبھی کبھار زلال چلنے کی
 آواز خاموشی کو توڑتی ہے۔ میرے قریب دو ہسپانوی مزدور جن کی آنکھیں اندھیرے
 کی مادی ہو چکی تھیں۔ گدالوں کی مدد سے ایک ستون کے گرد کھدائی کر رہے
 تھے۔ دریافت کرتے پر معلوم ہوا کہ وادی الکبیر کی مٹی ستونوں کی بنیادوں پر
 اثر انداز ہوتی رہتی ہے۔ اس ستون کی بنیاد بھی آہستہ آہستہ بیٹھ رہی تھی۔
 اس لیے اسے اکھاڑ کر دوبارہ ایسا دھکیا جائے گا۔ المنصور کا تعمیر کردہ مسجد کا
 یہ گوشہ صد درودانے سے دوری کی بناء پر بے حد پُر سکون رہتا ہے۔ اکثر شہنشاہ

برباری ہوتی برصغیر نازک ہمیشہ سے اس پہاڑ کی سیاہی سے خوفزدہ رہی ہے۔ الناصر
 نے اپنا بے مثال محل مدینۃ الزہر اس پہاڑ کے دامن میں تعمیر کیا تھا۔ صد درودانے
 کے باہر سنگ مرمر سے تراشیدہ زامہرا کا مجسمہ نصب کیا گیا۔ زامہرا نے ایک نظر
 سفید مجسمے کے عقب میں پھیلے ہوئے سیاہ کوہ پر ڈالی اور دُکھ سے کہا: "الناصر!
 تم دیکھ رہے ہو کہ ایک خوبصورت چہرے کو ایک مبشری نے آغوش میں
 لے رکھا ہے۔"

ایک بڑا میکینک ہیٹ اوڑھے چُست جین اور آتشیں سُرُخ بلاؤز میں شبکی
 لپٹی۔ بلاؤز کے اوپر والے دو ٹخن اور تانہ نین، قوت جہانی سے مجبوراً کھلے یقیناً
 کسی منہ زور گھوڑے کے نتھنوں میں چھنی باگوں کی طرح تے تے آمادہ علیحدگی۔
 ایک لڑکی گیلری کی دوسری جانب سے آہستہ آہستہ بے حیائی میں ملتی ہوئی
 آئی۔ اس نے ہیٹ کا زاویہ درست کیا اور مینار کے قدموں میں کچے شہر کی
 فلم بنانے میں محو ہو گئی۔ کیمرے کی آنکھ میں آنکھ ڈالے ایڑیوں کے بل بے حد
 احتیاط سے حرکت کرتی ہوئی، نیز کو قرطبہ کی چھتوں پر سے سرکاتی دیوار مسجد تک
 آئی۔ پھر صحن مسجد کو سمیٹا اور اس کے بعد لینز کا دہانہ مجھ پر کھل گیا۔ اس کی
 ایک آنکھ تو کیمرے کے ساتھ ہی چپکی رہی مگر دوسری چھپاک سے کھل گئی۔
 "ادہ" اس نے گڑبڑا کر کیمرو نیچے کر لیا۔

میکینک ہیٹ کے سائے میں کالی بھورا آنکھیں حیرت زدہ کھلی ہوئیں۔ لب
 نیم دا ابھی تک "ادہ" کی حالت میں۔ رنگ بیشتر یورپی لڑکیوں کی طرح کچی سی لیا کپا
 سفید نہیں بلکہ گاڑھے دودھ جیسا اور عقب میں میرا مورنیا کی سیاہ چوٹیاں۔
 میں دیکھ رہا ہوں کہ ایک خوبصورت چہرے کو ایک مبشری نے آغوش
 میں لے رکھا ہے۔

"سوری" لب "ادہ" کی گولائیوں سے عاری ہو کر بھنج گئے۔

آسٹریا، یوگوسلاویہ..... میں اس خیال سے ایک دم دہشت زدہ ہو گیا کہ جس ستون کے ساتھ میں ٹیک لگائے بیٹھا ہوں اس کے اور میرے گھر کے درمیان ابھی نصف دنیا کی اجنبیت حائل ہے جسے عبور کرنے کے بعد ہی میرے کھجوروں کے جھنڈ نظر آئیں گے۔ اس وقت میں اُن سے بہت دُور ہوں ایسے بے چین لمحے ستیاج کے لیے ایک عذاب سے کم نہیں ہوتے۔ وہ ان موقعوں پر بلندی پر تنے رستے پر کر توب دکھانے والے کی طرح ہوتا ہے جو نہ چاہتے ہوتے بھی نظریں جھکا کر پستیوں کی جانب دیکھتا ہے اور اس کے پاؤں ڈنگانے لگتے ہیں۔ اس عذاب سے بچنے کی ایک ہی صورت ہوتی ہے حرکت! چنانچہ میں نے فیصلہ کر لیا کہ دوسرے روز سیرامورنیا کے دامن میں بکھرے مدینۃ الزہرا کے کھنڈرات دیکھ کر اسی شب اشبیلیہ کے لیے روانہ ہو جاؤں گا۔

تیز دودھیا روشنی کا ایک گولا مچھوٹا اور سینکڑوں ستون تاریکی میں سے نکل کر ایک لمحے کے لیے ظاہر ہوئے اور فوراً دھندلا گئے۔ فلیش کی روشنی کے پیچھے میکسیکن ہیٹ کیمبرے میں اکٹھے جاتے بڑی تندہی سے تصویریں اتار رہا تھا۔

”ہیلو! میں نے وہیں بیٹھے بیٹھے زور سے کہا۔

”ہیلو۔ ہیلو“ پوری عمارت گونجنے لگی۔

کیمبرہ بجلی کی سی تیزی کے ساتھ اکٹھے سے ہٹا اور اُس نے انتہائی سراپگی کے عالم میں ادھر ادھر دیکھا۔

”ہے! میکسیکن ہیٹ“ میں نے اس کی گھبراہٹ سے نطف اندوز ہوتے ہوئے اندھیرے میں ایک اور تیر چھینکا۔ اس وار سے اُس نے سمت کا تعین کر لیا اور ستونوں کو ٹوٹتی میرے پاس چلی آئی۔

”کون ہے؟“ اُس نے آنکھیں میچ کر پوچھا۔

عبدالرحمن الداخل کے حصے اور محراب کی تصاویر اتار کر کلیسا کے پیٹ میں اُتر جاتے ہیں اور یوں کلیسا کے پچھوڑے میں المنصور کے ستون ان کے بے ہنگم قفسوں اور فلیش کی شگلی لائٹوں کی بوچھاڑ سے محفوظ رہتے ہیں اور اگر کوئی تجسس ظاہر بھی کرے تو گاڈ اُسے یہ بتا کر ڈرا دیتا ہے کہ المنصور کا حصہ عیسائی غلاموں کے ہاتھوں تعمیر ہوا تھا جن کی رومیوں ابھی تک اس کی تاریکیوں میں منڈلاتی ہیں۔

پچھلے سات روز کی مسلسل آوارہ گردی کے بعد اب قرطبہ کے گلی کو چے میرے لیے ایک کھلا نقشہ تھے۔ باب المنصور میرے لیے مروجی دروازہ تھا۔ پلازا نو سے انتونیر، چوک نواب صاحب اور کالے غورس، کالے کامیڈاس، المنصور، دوسبرو، کوریلا کو پھٹلاں والی گلی، کوچہ جوگیاں، کوچہ نقارچیاں، کوچہ چٹہ محل اور کوچہ چابک سواراں وغیرہ کہہ لیجئے۔ قرطبہ کی دو گلیاں تو ایسی ہیں جہاں کھڑے ہو کر آپ بجا طور پر ”لہور لہور لے!“ کا نعرہ بلند کر سکتے ہیں۔ یعنی پوٹے اقبال اور کالیے لاہور۔

آمد کے پتے روز جب گاڑی کی رفتار قرطبہ کے نواح میں پسینہ کرتا دیکھ کم ہونے لگی تو ایک جانب کھجوروں کا ایک وسیع جھنڈ نظر آیا۔ چاہت وطن کی باطنی جس کچھ یوں بیدار ہوئی کہ جیسے یہ تو مقبرہ جہانگیر کے پہلو میں کھجوروں کا جھنڈ نظر آیا ہے۔ گاڑی بتدیج آہستہ ہو کر رادی کے پل پر سے گزری گئی۔

دربار میں رواں کشتیوں میں سے ہاتھ بلند ہوں گے اور پھر دس ماہ بعد لاہور شیش کا شور مجھے گھر واپسی پر خوش آمدید کہے گا۔ شاید اسی نفسیاتی اطمینان کی بناء پر قرطبہ سے رخت سفر باندھنے کو جی نہ چاہتا تھا۔ سفر تو مکمل ہو چکا ہے میں گھر واپس آ گیا ہوں..... پھر مجھے اشبیلیہ اور غرناطہ کا خیال آیا۔ غرناطہ سے بڑا غم افریقہ کتنا دُور ہو گا..... سوڈیٹھ سو میل۔ اور ابھی مجھے یہ شہر دیکھ کر ہسپانیہ کے طویل مشرقی ساحل کے ساتھ ساتھ فرانس واپس جانا تھا پھر سوئٹزر لینڈ